ناسخ

سید شبیہ الحسن

ساہتیہ اکادمی

ناسخ

سرورق کے آخری صفحہ پر سنگ تراشی کے جس نمونے کی تصویر دی گئی ہے، اس میں تین جیوتشی بھگوان بُدھ کی ماتا مہارانی مایا کے خواب کی تعبیر بیان کر رہے ہیں۔ اور ان کے نیچے ایک کاتب بیٹھا ان کی تعبیر قلمبند کر رہا ہے۔

یہ شاید ہندستان میں لکھنے کے فن کی قدیم ترین تصویری مثال ہے۔

(ناگ ارجن کونڈ۔ دوسری صدی عیسوی)

(بشکریہ نیشنل میوزیم۔ نئی دلّی)

ناسخ

سیّد شبیہ الحسن

ساہتیہ اکادمی

Nasikh : A monograph by Shabihul Hasan on the urdu author. Sahitya Akademi, New Delhi (1985), Rs. 20.

© ساہتیہ اکادمی

پہلا اڈیشن : ۱۹۸۴ء

ساہتیہ اکادمی

ہیڈ آفس :

رویندر بھون، ۳۵ - فیروز شاہ روڈ - نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

علاقائی دفاتر :

بلاک ۷ - بی ، رویندر سروور اسٹیڈیم - کلکتہ ۷۰۰۰۲۹

۱۷۲، ممبئی مراٹھی گرنتھ سنگھرالیہ مارگ ، دادر ، بمبئی ۴۰۰۰۱۴

۲۹ ، ایلڈامس روڈ ، تینام پیٹھ ، مدراس ۶۰۰۰۱۸

قیمت : بیس روپے

مطبع : دِمل آفسیٹ پنچشیل گارڈن نوین شاہدرہ دہلی ۳۲

فہرست

ابتدائیہ

باب اول ۱۱

سوانحی حالات

شخصیت کا ارتقار

عہد جلاوطنی

وفات

عادات و اطوار

حلقۂ تعارف و تلامذہ

باب دوم ۶۴

کلیات اشعار

شعری ذخیرہ کی تفصیل

مختلف اصناف کا جائزہ

ناسخ کے مداح و نکتہ چین

اصلاحاتِ زبان

باب سیوم ۱۰۴

ناسخ کی فنکاری

جائزہ

تجزیہ اور محاکمہ

کتابیات ۱۴۴

ابتدائیہ

اردو زبان ہندستان کی اس دل کش مشترک تہذیب کی یادگار ہے جسے عظیم تاریخی قوتوں نے عرصہ دراز تک برسرعمل رہنے کے بعد تعاون اور باہمی خیر سگالی کی بنیاد پر مربوط و مستحکم کیا تھا' تہذیب اور تاریخ کی یہ قوتیں ہندستانی بھی تھیں اور غیر ہندستانی بھی مگر یہ زرخیز تہذیب اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی اردو زبان ایسے وقت وجود میں آئی کہ جب غیر ہندستانی عناصر بھی مستقل طور پر ہندستانی بن گئے اس لیے جس اختلاط نے اس زبان کو پیدا کیا اس نے ابتدا ہی سے اسے ہندستانی مزاج بھی بخشا۔ اسی لیے اردو بیرونی عناصر پر مشتمل ہونے کے باوجود مزاج اور فطرت' وطن اور آب و ہوا کے اعتبار سے ایک ہندوستانی زبان ہے۔ شمالی ہندوستان میں اس کا واضح خط و خال کے ساتھ ارتقا تیرھویں صدی عیسوی کے بالکل آغاز میں دکھائی دیتا ہے لیکن اس سے کافی پہلے سندھ اور پنجاب میں اس کے تولیدی عناصر اکٹھا ہونا شروع ہو گئے تھے ابھی یہ زبان ایک بولی سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی کہ چودھویں صدی عیسوی کے آغاز میں ہندستان کے دکنی علاقہ میں پہنچ گئی اور جلد ہی اس پورے علاقہ میں نہ صرف پھیل گئی بلکہ کاروباری مقاصد کے علاوہ ادبی مقاصد کے لیے بھی استعمال ہونے لگی اور پھر سترھویں صدی کے اختتام تک اس میں ایسا شاندار ادب پیدا ہوا کہ دکنی اردو نے اپنی ایک مستقل حیثیت بنالی جبکہ شمالی ہندستان میں اس کا ارتقا بہت سے اسباب کی بنا پر سست رہا اور اس درمیان میں اس زبان کو عوامی رواج تو خوب ہوا مگر ادبی استعمال و تخلیق میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی اس لیے کہ یہاں فارسی کا غلبہ

اورنگ زیب تک ۱۷۰۷ء زیادہ رہا۔ اس درمیان میں یہ زبان نکھرتی رہی اور قوت حاصل کرتی رہی اس کی روزافزوں دل کشی اور عوامی مقبولیت کا راز یہ تھا کہ اس نے ہر تہذیب سے نہایت اچھے اور صحت مند عناصر کو جذب کیا اور بیرونی اور مقامی زبانوں کے ذخیرہ الفاظ میں سے نہایت منتخب اور خوشگوار حصّہ کو اپنے اندر سمیٹا تھا۔ یہ زبان اپنی اندرونی توانائی صلاحیتوں اور استعمال کی سہولتوں کی وجہ سے نہ صرف ہندستان میں بلکہ بیرون ہند میں بھی بہت سے ملکوں میں اپنا حلقۂ اثر پیدا کرنے میں کامیاب ہوئی۔ شروع ہی سے تاریخی اور ثقافتی اسباب کی وجہ سے اس زبان کی اُٹھان ایسی رہی کہ اس نے اپنی وسعت اور گہرائی کی وجہ سے علاقائی قید و بند کو کبھی قبول نہیں کیا شمالی ہندستان اس کا اصلی وطن اور مرکز رہا مگر ہندستان میں دوسری زبانوں کے علاقہ میں بھی اس کا چلن علاقائی زبانوں کے دوش بدوش رہا۔

سترھویں صدی عیسوی کے اختتام تک یہ زبان دہلی اور اس کے اطراف میں ترقی کر کے ادب پیدا کرنے کے لائق ہو گئی تھی اور دوسری طرف فارسی کی گرفت بھی کافی کمزور ہو چکی تھی جس کے نتیجہ میں اٹھارھویں صدی کے آغاز میں اس زبان میں اتنا وافر ادب پیدا ہونے لگا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اس نے جست لگائی ہو۔ اس عہد میں دہلی اور اس کے اطراف میں اتنے شاعر و ادیب پیدا ہوئے کہ جنھوں نے انفرادی طور پر اپنی دائمی اہمیت تسلیم کرا لی اور اس زبان کے ادبی اور عوامی مستقبل کو بھی محفوظ بنا دیا۔ فطرتاً اس زبان میں تراش خراش اور اسے نیا مزاج دینے کے ابتدائی اور بنیادی مراحل دہلی میں انجام دیے گئے۔ اس عہد میں اس زبان کو ترقی دینے میں زبان سازی اور ادب سازی کا مرتبہ جن لوگوں نے حاصل کیا ان میں سب سے پہلا نام ولی دکنی کا ہے کہ جن سے پورے شمال کو فیض پہنچا۔ پھر حاتم، مظہر جان جانان، سودا، میر تقی اور خواجہ میر درد اردو زبان و ادب کے سلسلہ میں عہد ساز و اہم کارنامے انجام دینے والے فنکار تسلیم کیے گئے ہیں۔

اٹھارھویں صدی کے تقریباً وسط میں سیاسی اور تاریخی اسباب کی بنا پر لکھنؤ میں رفتہ

رفتہ اردو کا ایک نیا مرکز وجود میں آگیا۔ یہاں اردو زبان کو نئی حکومت اور نئے تہذیبی ماحول میں ترقی کرنے کا موقع ملا۔ جس کی وجہ سے نئے ماحول اور حالات کے مطابق اس زبان اور اس کے ادب میں نئے اصلاحات کی ضرورت محسوس ہوئی لکھنؤ میں اصلاحات کا یہ عمل جس نے اردو کو نئی شان، نئی چستی اور نئی ابلاغی توانائی بخشی بہت سے فنکاروں کا رہین منّت ہے۔ جن میں میر حسن، میر خلیق، انشا اور مصحفی وغیرہ شامل ہیں لیکن اصلاحات کے عمل کو قطعی اور ہمہ گیر شکل دینا اور آخری تراش خراش کے بعد اسے ایک مثالی زبان بنانا ان فنکاروں کا کام تھا جن کے راہ نما ناسخ تھے اسی لیے وہ اپنے عہد کے اہم ادب ساز و مصلحِ زبان مانے گئے۔

باب اوّل

(۱)

اودھ میں شجاع الدولہ کی حکومت کا آخری زمانہ تھا(1775-1754ء) ابھی لکھنؤ کا ادبی مرکز باقاعدہ قایم نہیں ہوا تھا مگر وہ حالات پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے کہ جو جلد ہی ایک ایسے جدید ادبی مرکز کے قیام کی بشارت دے رہے تھے جسے اردو زبان و ادب کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہونے والی تھی کہ ایک ایسے بچّہ کی ولادت ہوئی کہ جس نے بعد میں ناسخ کا علامتی تخلص اختیار کیا زبان و شعر کی اصلاح میں بڑا نام پیدا کیا اور لکھنؤ کے ادبی اسکول کو قائم کرنے والے فنکاروں کا رہبر بن گیا۔ صحیح تاریخ ولادت کسی تذکرہ نگار نے نہیں لکھی ہے مگر دستیاب شہادتوں کے مطابق ناسخ کی ولادت (۱) 7 محرم 1186ء 15 اپریل 1772ء جمعہ کے دن ہوئی۔ یہ اندازہ رشک، جو ناسخ کے شاگرد تھے، کی کہی ہوئی تاریخ وفات سے لگانا ممکن ہوا (۲) امام بخش نام رکھا گیا خود ان کے والد کا نام شیخ خدا بخش تھا یہ نہیں معلوم کہ ان کا اصلی وطن کہاں تھا اور نسلی سلسلہ کہاں پہنچتا ہے۔ پہلے وہ لاہور میں رہتے تھے۔ بعد میں فیض آباد منتقل ہوئے اور پھر اودھ ہی کے ہو رہے یہیں ناسخ کی ولادت ہوئی۔

۱؎ محرم کی 7 تاریخ کا تعین ناسخ کے ایک مصرعہ سے ہوتا ہے "کہ ہے میرا تولد ہفتم ماہ محرم کا" جو ان کے دیوان اول میں موجود ہے۔

۲؎ یہ قطعہ تاریخ باب دوم میں نقل ہوا ہے۔

خدا بخش تاجر پیشہ آدمی تھے۔ خیموں کا کاروبار کرتے تھے کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ خوردہ فروش تھے اور ایک بساط خانہ کے مالک تھے۔ ممکن ہے کہ ان سب مشاغل سے ان کا تعلق رہا ہو ان کے صاحب حیثیت اور مالدار ہونے کی شہادتیں موجود ہیں خدا بخش کا انتقال لکھنؤ میں پنج شنبہ 24 دسمبر 1801ء میں ہوا ناسخ کی والدہ کا حال اتنا بھی نہیں معلوم۔ صرف یہ معلوم ہے کہ ان کا انتقال لکھنؤ میں 1781ء میں ہوا۔ دونوں کی قبریں مع لوح کے کچھ زمانہ پہلے تک گنو گھاٹ کے قبرستان میں موجود تھیں چونکہ اس قبرستان میں بالعموم اہل سنت کے مردے دفن ہوتے تھے اس لیے قیاس یہ ہے کہ ان کے والدین کا مذہب سنّی رہا ہوگا۔ ان باتوں سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ناسخ کے والدین 1781ء سے پہلے جبکہ ناسخ کی طفولیت کا زمانہ تھا فیض آباد سے منتقل ہو کر لکھنؤ آگئے تھے غالباً انھوں نے فیض آباد اسی وقت چھوڑا ہوگا جب آصف الدولہ 1797 – 1775ء نے لکھنؤ کو دارالسلطنت بنایا ہوگا اور خود لکھنؤ منتقل ہو گئے ہوں گے (1776ء) ان حالات میں فطرتاً تجارتی لغراض اور اس پیشہ کے نقطۂ نظر سے کہ جس سے خدا بخش وابستہ تھے، فیض آباد کے مقابلہ میں لکھنؤ زیادہ منفعت بخش ہو گیا ہوگا خدا بخش کے انتقال کے بعد ناسخ اور خدا بخش کے عزیزوں میں میراث اور ترکہ پر نزاع پیدا ہوئی اور مقدمہ بازی کی نوبت آئی اس مقدمہ کے سلسلہ میں خدا بخش کے بھائیوں نے دعویٰ کیا کہ ناسخ خدا بخش کے بیٹے ہی نہیں ہیں بلکہ لے پالک یا غلام ہیں خیر فیصلہ تو ناسخ کے حق میں ہو گیا اور میراث بھی انھیں مل گئی مگر اس تہمت کی شہرت اتنی ہوئی کہ جس سے ناسخ کو مدت العمر تکلیف پہنچتی رہی بعد میں چونکہ ناسخ کو بے حد ادبی اور سماجی اہمیت حاصل ہوئی اس لیے جہاں ان کے مدّاحوں کا حلقہ بڑھا، نکتہ چینی اور عیب جوئی کرنے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا اور نکتہ چینی کے سلسلہ میں ان کے حسب نسب پر برابر طعن کیے جاتے رہے ناسخ نے دو رباعیاں کہیں جن میں اس سارے قضیہ کی طرف اشارہ بھی ہے اور اس تہمت پر دلی تکلیف کا اظہار بھی ہے۔ میراث

کے جھگڑوں ہی سے یہ علم ہوا کہ ناسخ کے متعدد چچا بھی تھے لیکن ان کی تعداد اور حال یا ناسخ کے چچازاد بھائیوں کے وجود کا کوئی علم نہیں ہے۔ خود انھوں نے شادی نہیں کی تھی اس لیے اولاد کا سوال نہیں۔ خاندان ناسخ کے متعلق ساری باتیں اور اطلاعات اسی حد تک محدود ہیں۔

ان کی تاریخ انتقال کے متعلق کسی طرح کا شک وشبہ نہیں ہے مرتے وقت وہ بہت معروف شخصیت تھے اور وفات کی تاریخیں بھی بہت کہی گئیں یہاں بھی ہمیں ان کے شاگرد رشک کا ممنون ہونا پڑے گا اس لیے کہ صرف انھوں نے ایسی تاریخ کہی ہے جس سے سال کے علاوہ مہینہ کی تاریخ اور دن کا بھی علم ہوتا ہے (۱) رشک کی کہی ہوئی تاریخ کے مطابق ان کا انتقال پنج شنبہ کے دن 24 جمادی الاولیٰ 1254ھ 15 اگست 1838ء کو ہوا۔ کچھ لوگوں نے ان کی عمر کا اندازہ 65 - 64 سال لگایا ہے اور کچھ لوگوں نے ۷۰ سال کے قریب عمر تجویز کی ہے مگر اب قطعی شہادتوں کے پیش نظر ان اندازوں کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ انھوں نے مجموعی طور پر ہجری حساب سے اڑسٹھ سال چار ماہ اور سترہ دن کی عمر پائی اور عیسوی حساب سے چھیاسٹھ سال چار ماہ اور پانچ دن زندہ رہے۔

ابتدائی تعلیم وتربیت کا کچھ حال نہیں معلوم۔ دستیاب حالات کے پیش نظر اندازہ ہوتا ہے کہ خدا بخش نے ان کی تعلیم کا کوئی خاص انتظام نہیں کیا اور کاروبار تجارت میں لگا دیا۔ وہ تجارت کے پیشہ میں شاعری کے دور عروج میں داخل ہونے کے بعد بھی مشغول رہے مصحفی کے بیان کے مطابق (ریاض الفصحا بضمن ناسخ) وہ 37 سال کی عمر میں بھی تجارت کے ذریعہ سے گزر بسر کرتے تھے مگر بعد میں انھوں نے تجارت کا پیشہ جب کہ ان کے روابط وسیع ہوئے اور شاعری کی وجہ سے آمدنی کے بہت سے دروازہ ان پر کھل گئے تھے، چھوڑ دیا تھا پوری عمر انھوں نے فارغ البالی کے ساتھ بسر کی۔ تجارت چھوڑنے کے بعد بھی نہ صرف وہ اپنا خرچ اچھی طرح پورا کرتے رہے بلکہ دوستوں، ملاقاتیوں اور مفلوک الحال ادیبوں اور

---

(۱) باب دوم میں یہ قطعہ مندرج ہے۔

شاعروں کے ساتھ سلوک واحسان کا سلسلہ انھوں نے سیر چشمی کے ساتھ جاری رکھا۔اس معاملہ میں وہ فراخ دل واقع ہوئے تھے ان کے پاس کنبہ نہیں تھا مگر وہ کنبہ پرور تھے۔ مرنے کے بعد بھی انھوں نے اچھا خاصا ترکہ چھوڑا جو ان کی وصیّت کے مطابق ان کے قدیم دوست مرزائی صاحب کے تصرّف میں آیا یہ بھی اسی بات کی دلیل ہے جیسا کہ آزاد نے لکھا ہے (آب حیات) 'مکان مردانہ تھا عیال کا جنجال نہیں تھا'۔ اپنے اشعار ہی کو اپنی اولاد سمجھتے تھے اس حساب سے ان کی اولاد کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے چنانچہ کہتے ہیں ؎

کوئی مضمون ہوتا ہے طبیعت سے اگر پیدا
یہ ہوتی ہے خوشی مجھ کو ہوا گویا پسر پیدا

وہ ابھی ۱۰۔ ۹ سال کے رہے ہوں گے کہ ان کی ماں کا انتقال ہوا اس سے پہلے ہی یہ خاندان لکھنؤ پہنچ چکا تھا یہ نہیں معلوم کہ لکھنؤ میں بود و باش اختیار کرنے اور کاروبار جمانے میں اس خاندان کو کن مراحل سے گزرنا پڑا۔ کہا جاتا ہے کہ کوئی شخص کریم بخش بساطی تھا اس نے ناسخ کی پرورش کی مگر باپ کی موجودگی میں کریم بخش کو بساط پرورش بچھانے کی ضرورت کیوں درپیش ہوئی اس کا کوئی جواب نہیں ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ فیض آباد میں کوئی نواب محمد تقی نامی تھے انھیں بانکے ترچھے رکھنے کا شوق تھا وہی ناسخ اور آتش کو لکھنؤ لائے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ لکھنؤ کے کوئی رئیس میر کاظم علی تھے انھوں نے ناسخ کو بیٹا بنا لیا تھا وہ مرے تو وصیت کی رُو سے ان کو بہت دولت ہاتھ آئی (گل رعنا بضمن ناسخ) لیکن یہ تمام باتیں فی الحال قیاسات اور افواہوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ ناسخ کے ابتدائی حالات اس لیے بھی زیادہ نہیں معلوم ہیں کہ یہ خاندان اس عہد میں کسی برتری اور شان کا حامل نہیں تھا ان کا سارا بچپن تذکرہ نویسوں کی رائے کی اکثریت کے مطابق لکھنؤ میں گزرا۔ لکھنؤ میں ان کی مشغولیتوں اور رجحانات و میلانات کے لیے کئی سمتیں نمودار ہوئیں۔ تجارت کے پیشہ میں وہ شروع ہی سے مصروف رہے تھے یہ پیشہ انھوں نے بعد میں چھوڑ دیا مگر اس کی

عطا کردہ عادت و فطرت ان میں ہمیشہ باقی رہی تاجر اپنی دوکان سجانا اور بازار کے ذوق کے مطابق مال مہیا کرنا خوب جانتا ہے ناسخ جب بڑے شاعر اور مصلح زبان مان لیے گئے تو مسلسل اس نکتہ کی طرف ان کی توجہ دانستہ یا نادانستہ مبذول رہی انھیں اپنی ادبی دوکان سجانے میں اس عہد کے تمام فنکاروں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ دلچسپی تھی۔ ان کے یہاں ہیئت کی زیبائش و آرائش میں زیادہ اہتمام بھی شاید اسی لیے تھا اور وہ اس سے بھی خوب واقف تھے کہ لکھنؤ کے ادبی بازار میں کون سا سکّہ زیادہ چل سکتا ہے وہ ٹکسال نامی محلّہ میں رہتے تھے سماجی ضرورت اور تقاضوں کے مطابق عمر بھر ادبی سکّے ڈھالتے رہے اور بازار شناسی کا بہتر ملکہ رکھنے کی وجہ سے ان کا سکّہ دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ چلتا رہا۔

اُس زمانے کا لکھنؤ بہت سی شہری اور ثقافتی مشغولیتوں اور دلچسپیوں کا مرکز تھا منجملہ ان کے پہلوانوں اور بانکوں کا ادارہ بھی تھا۔ لکھنؤ کے بانکوں نے اسی زمانہ میں بحیثیت ایک گروہ کے اپنی انفرادیت قایم کی تھی۔ دوسری طرف فنون سپہ گری۔ کسرت اور ریاضت، جسم سازی اور پہلوانی کا ہر طرف چرچا تھا کوئی محلّہ شاید ہی ایسا رہا ہو کہ جس میں اکھاڑا نہ ہو اور پہلوانی کی تربیت دینے والے نامور استاد موجود نہ ہوں ناسخ کو بھی رفتہ رفتہ پہلوانی اور جسم سازی کا شوق پیدا ہوا انھوں نے ریاض شروع کیا اور کشتی لڑنے لگے تھوڑے ہی عرصہ میں ان کا جسم تیار ہو گیا اور غالباً انھوں نے تربیت بھی مکمل کر لی، ان کے اس عہد کا حلیہ یوں بیان کیا جاتا ہے 'سیاہ فام، مضبوط گٹھا ہوا بدن، سر منڈا ہوا، داڑھی خشخشی، فربہ اور توانا' زیادہ تر کھاروے کی لنگی اور کرتا پہنے رہتے تھے۔ جاڑا ہوا تو دہرا کرتہ پہن لیا؛ تجارت کی طرح ان کی پہلوانی کا سلسلہ بھی بیرون خانہ کی حد تک چھوٹ گیا لیکن ورزش اور ڈنڈ مگدر وغیرہ کی مشق کا سلسلہ عمر بھر جاری رہا وہ پچھلے پہر ہی سے ورزش شروع کر دیتے تھے اور یا غفور کے عدد کے مطابق 1296 ڈنڈ لگاتے تھے اور پھر گھی میں تر بتر بیسنی پراٹھے کھاتے تھے۔ بعد میں ان کی فنکاری اور شاعری پر پہلوانی اور جسم سازی کے اثرات

کواور اس شوق کے ارتقاعی انداز کو بغیر کسی مشکل کے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اکھاڑا ترک کر دیا تھا مگر ادبی معرکہ بھی اس عہد میں ایسا اکھاڑا تھے کہ جس میں وہ اپنی دیرینہ عادت اور قدیم شوق کو ادبی سطح پر اور اودھ کے سیاسی مسائل میں الجھ کر سیاسی سطح پر نبوٹ اور بانک کے سارے داؤں پیچ صرف کر کے اپنے ذوق کی تکمیل بھی کر لیا کرتے تھے۔ تیسری سمت شعروشاعری کا چرچا اور مشاعروں کا وہ ہنگامہ اور دار وگیر تھی جس سے لکھنؤ کی پوری فضا میں اس زمانہ میں ہلچل سی پڑی ہوئی تھی۔ کچھ مشاعروں کی قید نہ تھی وہ لکھنؤ کے جس گلی کوچہ میں نکل جاتے ہوں گے۔ شعروشاعری کی دلچسپ اور کبھی کبھی امن شکن محفلیں اور صحبتیں انھیں دیکھنے کو مل جاتی ہوں گی۔ یقیناً وہ شعروشاعری کے پہلے محض تماشابیں رہے ہوں گے، یہ نہیں معلوم کہ کب ان کے اندر چھپے ہوئے فنکار نے انگڑائی لی اور کب انھوں نے اس فن شریف کو اس طرح گلے لگایا کہ ہر مشغلہ چھوٹ گیا۔ شادی بیاہ اور آل اولاد کی بھی پرواہ نہ کی اور ہمیشہ کے لیے اسی کے ہو رہے مصحفی (وفات 1824ء) کہتے ہیں کہ بیس برس کی عمر میں انھوں نے شاعری شروع کی (ریاض الفصحاء) یہ ذکر ہو چکا ہے کہ ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت کا بظاہر کوئی معقول انتظام نہیں ہوا۔ جب انھوں نے اپنے اندر کے شاعر کو سر اٹھاتے محسوس کیا ہوگا تو غالباً اسی وقت انھیں اپنی کم علمی پر ندامت اور پریشانی ہوئی ہوگی اور انھیں یہ خیال پیدا ہوا ہوگا کہ تاخیر کے باوجود وہ اپنی تعلیم کو اس حد تک تو ضرور مکمل کر لیں کہ جاہل نہ کہلائیں اور آسانی کے ساتھ شعرگوئی کا شوق پورا کر لیں۔ یہی شوق انھیں فرنگی محل لے گیا ہوگا جہاں حافظ وارث علی کا درس وتعلیم کا ایک بڑا حلقہ موجود تھا انھوں نے یہی حلقہ منتخب کیا اور حافظ صاحب سے ثانوی معیار کی کتابیں پڑھیں، غالباً اس میں عربی کے علاوہ فارسی کے ادبیات بھی شامل رہے ہوں گے۔ بہت ممکن ہے کہ انھوں نے فرنگی محل کے دوسرے عالموں سے بھی پڑھا ہو بہر حال متوسط معیار تک ان کی عربی و فارسی کی لیاقت پہنچ گئی اور پھر وہ تمام عمر

اپنے طور پر اور لکھنؤ کے بہت سے صاحبانِ کمال کی غیر رسمی مدد سے جن میں قتیل کے ایسا نامور فارسی داں بھی شامل تھا، اپنی لیاقت بڑھاتے رہے ان کے استادوں میں حافظ وارث علی اور مرزا مغل کے علاوہ اور کسی ایسے شخص کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی جس کا نام بھی معلوم ہو اور ناسخ نے خود اسے اپنا استاد بھی ظاہر کیا ہو۔ حافظ وارث علی سے ان کے تعلقات برابر قایم رہے ان کے کلیات میں ایک قطعہ تاریخ موجود ہے جو انھوں نے ان کے یہاں لڑکا پیدا ہونے پر کہا تھا اسی قطعہ میں انھیں اپنا استاد بھی ظاہر کیا ہے۔ یہ قطعہ 2-1801ء سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کے کلیات میں متعدد قطعات تاریخ ایسے ہیں جنھیں انھوں نے مرزا مغل کی وفات پر نظم کیا اور ایک قطعہ میں مرزا مغل کو اپنا استاد بھی کہا ہے۔ قطعات کی اندرونی شہادت سے ان مرزا مغل بیگ کے نہ شاعر ہونے کا اندازہ ہوتا ہے اور نہ عالم ہونے کا ہاں ایک قطعہ میں انھیں رستم وقت کہا ہے اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے پہلوانی میں ان کے استاذ رہے ہوں یوں تو ان کے کلیات میں متعدد مرزا مغل ایسے ہیں جن کی وفات پر انھوں نے تاریخ کہی اور اس عہد میں بہت سے لوگ لکھنؤ میں مرزا مغل کے نام سے مشہور تھے اور ان میں سے کئی شاعر بھی تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی ناسخ کا استاد نہ تھا اس لیے کہ ہر ایک کا سن وفات ان مرزا مغل سے مختلف ہے کہ جو 19-1818ء میں مرے تھے اور جنھیں ناسخ اپنا استاد بتاتے ہیں۔ جتنا انھوں نے پڑھا اور پھر اپنی ذاتی کوشش سے جو کچھ حاصل کیا اس کے حساب سے ان کی فارسی کی قابلیت اچھے معیار کی اور عربی دانی متوسط درجہ کی کہی جا سکتی ہے اور شاعری کے علوم و فنون پر ان کی اطلاع ماہرانہ تھی اس کے علاوہ اس عہد کے رائج علوم ہیئت، نجوم، منطق، فلسفہ، حکمت اور حدیث وغیرہ میں باقاعدہ تعلیم کی وجہ سے نہ سہی بلکہ مطالعہ اور اہل علم سے خوشہ چینی کی وجہ سے اچھا خاصا درک رکھتے تھے۔ زبان کے رموز اور تلفظ و لغت کے مسائل سے بہت اچھی واقفیت پیدا کر لی تھی اور آخر عمر میں

تو زبان دانی میں حقیقتاً استادی کے درجہ پر پہنچ گئے تھے ان کے باخبر اور ذی استعداد ہونے کی سب سے معتبر شہادت خود ان کے منظومات سے فراہم ہو جاتی ہے اس طرح آب حیات میں آزاد کا یہ بیان حقیقت پر مبنی ہے کہ" اگرچہ عربی استعداد فاضلانہ نہ تھی مگر رواج علمی اور صحبت کی برکت سے فن شاعری کے ضروریات سے پوری واقفیت تھی۔"

(۲)

بیس برس کی عمر میں ان کا شاعری شروع کرنا قرین قیاس ہے مگر ان کے کلیات میں ایک قطعہ تاریخ امیرالدولہ حیدر بیگ خاں کی وفات پر موجود ہے جس سے 92—1791ء 1206ھ حاصل ہوتا ہے اگر یہ قطعہ واقعتاً بروقت انھوں نے نظم کیا تھا تو شاعری کا آغاز کچھ پہلے ہوا ہوگا اس لیے کہ ایک مبتدی شاعر کو تاریخ گوئی کے میدان میں قدم رکھنے کے لیے کچھ مشق اور وقت درکار ہوتا ہے اور یوں تو ان کے کلیات میں سوداؔ کی وفات کا قطعہ تاریخ بھی موجود ہے اس وقت تو ان کی عمر تقریباً ۹ ہی سال کی رہی ہوگی۔ اس کی وجہ سے کچھ لوگ غلط فہمی میں پڑ گئے اور انھوں نے ان کی عمر کا اندازہ بہت غلط لگا دیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ سوداؔ کا قطعہ وفات انھوں نے بعد میں نظم کیا اس لیے کہ خود انھیں کے کہنے کے مطابق وہ ان کے عہد شاعری سے پہلے وفات پا چکے تھے۔ ان کے دیوان اوّل میں یہ شعر موجود ہے۔

پہلے اپنے عہد سے افسوس سوداؔ اٹھ گیا
کس سے ناسخؔ اس غزل کی جا کے لیں اب دادہم

انھوں نے جب بھی شاعری شروع کی ہو نہ ان کا کوئی پرسان حال تھا اور نہ کوئی ادبی سرپرست فطرتاً اس ادبی یتیم نے تھوڑی بہت شاعری کرنے کے بعد یہ فکر کی ہوگی کہ رواج کے مطابق وہ کسی استاد کو اپنا کلام دکھائے اس وقت میرؔ کا شہرہ بہت تھا

ان کی استادی مسلّم تھی ایک دن چپکے سے ان کے پاس پہنچ گئے اور کلام پر اصلاح اور شاگرد بننے کی خواہش کا اظہار کیا۔ مگر ظاہر ہے کہ میر اس وقت تک بوڑھے ہو چکے تھے وہ لکھنؤ اور اس میں نمودار ہونے والے نئے رنگ سے بیزار و بد دماغ رہتے تھے یوں بھی وہ اپنا شاگرد کسی کو کم ہی بناتے تھے انھوں نے وجہ جو بھی رہی ہو، صاف انکار کر دیا وہ مایوس ہوئے مگر یہی انکار ان کے لیے ایسا تازیانہ ثابت ہوا کہ جس نے ان میں نیا حوصلہ اور نیا عزم بھی پیدا کر دیا انھوں نے طے کر لیا کہ اب وہ کسی کی شاگردی نہیں اختیار کریں گے اور اپنے کلام پر خود محنت کریں گے اور خود ہی اصلاح دیں گے۔ حقیقت حال تو یہی ہے مگر مختلف تذکروں میں اور بالخصوص ان کے نکتہ چینوں نے ان کے استاد کی حیثیت سے بہت سے شاعروں کا نام لیا ہے جن میں مصحفی، محمد عیسیٰ، تنہا اور اکرم شامل ہیں یہ تذکرہ غالباً اس لیے چھیڑا جاتا تھا کہ استاد سے منحرف اور منکر ہونے کا غیر اخلاقی الزام ان پر لگایا جائے مگر کوئی بھی معتبر شہادت اب تک ایسی دریافت نہ ہو سکی ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ انھوں نے کسی شاعر کی شاگردی اختیار کی ہو۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ کوئی ایک فرد نہیں بلکہ لکھنؤ کا ہر مشاعرہ اور ہر ادبی حلقہ اور بڑے بڑے ماہر فن اور فلک زدہ بڈھے شاعروں کی ہر وہ نشست جو ان کے یہاں معمولاً ہوا کرتی تھی ان کے لیے استاد کا کام دیتی تھی۔ چنانچہ خود ہی کہتے ہیں ؎

کون سی طرز سخن ہے جو اسے آئی نہیں
کیوں نہ ہو شاگرد ہے ناسخ ہر اک استاد کا

یادش بخیر انیسویں صدی کے شروع ہی سے لکھنؤ میں مشاعروں کا زور بہت بڑھ گیا تھا یہ مشاعرے شاعروں کے لیے بہت سخت امتحان گاہ ہوا کرتے تھے ہر مشاعرہ اعتراض اور سوال جواب معمولات میں شامل تھا اور کسی مشاعرہ سے باعزت و آبرو غزل پڑھ کے لوٹنا مقام شکر سمجھا جاتا تھا مشاعروں کے علاوہ بھی شہر میں شاعروں کے درمیان چوٹیں

چلا کرتی تھیں، امرار کے دربار بھی جو بکثرت تھے ادبی معرکہ آرائیوں کے مرکز تھے۔ ناسخ مشاعروں میں شرکت کے لیے اکثر جاتے تھے ایک سامع کی حیثیت سے نہیں بلکہ سیکھنے اور سمجھنے کے لیے انھوں نے لکھنؤ کے بہت سے اہم اور تاریخی ادبی معرکوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس نوک جھوک سے انھوں نے فن کی باریکیاں اور شعر و شاعری کے دشوار گزار کوچوں سے واقفیت بہم پہنچائی، شعر کہتے تھے مگر مشاعروں میں پڑھتے نہیں تھے۔ تازہ معلومات کی مدد سے بار بار اور مسلسل اپنے اشعار کی خود ہی اصلاح کرتے رہتے تھے اپنے ہم عمر شاعروں سے اساتذہ کے کلام پر مباحثہ بھی کر لیتے تھے اتفاق سے انھوں نے عہد بھی اچھا پایا تھا جب وہ مشاعروں میں تماشائی کے طور پر جاتے تھے تو اس وقت بہت سے مبتدی، خوش گو اور اساتذہ موجود تھے اور مشاعروں کی زینت بنتے تھے کہ جن کی وجہ سے لکھنؤ کی ادبی فضا میں ہلچل اور گرمی رہتی تھی۔ انشا، مصحفی، منتظر، گرم، طالب علی عیشی، جرأت، قتیل، محمد صادق، اختر، تنہا اور اسی طرح کے نہ معلوم کتنے غزل گو تھے کہ جب مشاعروں میں بیٹھتے تھے تو ادب کی ایک کہکشاں کھل پڑتی تھی اس کے علاوہ اس عہد کے نامی گرامی امرار زیادہ تر ایسے تھے کہ خود شعر کہتے بھی تھے اور شاعروں کی سرپرستی اور قدر دانی بھی کرتے تھے ان میں سلیمان شکوہ (جن کے یہاں ناسخ کی آمد و رفت غالباً نہیں تھی) محمد تقی ہوس، محمد تقی ترقی، مرزا حاجی قمر زیادہ شہرت رکھتے ہیں ناسخ نے اس پورے ماحول سے ایک باہوش متعلم کی حیثیت سے پورا فائدہ اٹھایا اور ادبی نوک جھوک کا علمی پس منظر اپنے ذہن میں محفوظ کرتے رہے پھر بھی بہت دنوں تک مشاعروں میں نمودار ہونے کی انھیں ہمت نہ ہوئی جب لکھنؤ کے دہکتے ہوئے ادبی انگارے کچھ سرد پڑنے لگے اور معرکہ آرائیوں کے اہم فریق یا تو ختم ہو گئے یا سست پڑ گئے اور "جب زمانہ سارے ورق الٹ چکا اور میدان صاف ہو گیا تو میں نے غزل پڑھنی شروع کی اس موقع پر مرزا حاجی صاحب، مرزا قتیل اور قاضی محمد صادق اختر نے بڑی

قدردانی کی اوران کے دل بڑھانے سے کلام نے روز بروز رنگ پکڑنا شروع کیا لوگوں کے دلوں میں یہاں تک شوق پیدا ہوا کہ چوغزلہ کہہ کر پڑھتا تھا پھر بھی مشتاق رہ جاتے تھے۔"

(بیان ناسخ، آب حیات)

اس طرح وہ میدان شاعری میں دیر سے اترے شاید 6-1805ء میں مگر جلد ہی چھا گئے اور دھاک بٹھادی، اس بات کی کوئی شہادت نہیں موجود ہے کہ برسرِ مشاعرہ یا کسی ادبی بحث میں انھیں کبھی خفّت اٹھانا پڑی ہو اور یوں تو کون شاعر ایسا ہے جو اعتراضات سے بچا ہو۔ اس زمانہ کے سب ہی شاعر جن کا ذکر ہو چکا ہے اس عبوری دور کے شاعر تھے جس میں لکھنؤ کے نئے ریختے کی دیوار اٹھ رہی تھی یہ سب فنکار شعوری یا غیر شعوری طور پر نئے ادبی لکھنؤ کی تعمیر میں مصروف تھے ناسخ بھی اسی قبیلہ میں داخل ہوے اور بعد میں اپنی سوجھ بوجھ کی وجہ سے اس تحریک کے رہبر بلکہ ڈکٹیٹر بن گئے۔ ناسخ نے اس منزل سے ایک قدم اور آگے بڑھایا جو جدت پسند شعرا نے ابھی تک طے کی تھی اس لیے فطرتاً ان کی ہمت افزائی زیادہ ہوئی۔ ناسخ دیر سے میدان شاعری میں اترے مگر جلد فروغ حاصل کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے استادی کی مسند پر بیٹھ گئے اور اس طرح اب تک جو تاخیر ہوئی تھی اس کی اچھی تلافی ہو گئی۔ وہ کم عمری میں تو نہیں مگر جتنی کم مدت میں استادی کے مرتبہ پر پہنچے اس کی مثالیں تاریخ ادب اردو میں کم ہی مل سکتی ہیں۔ اتفاقات اور بہت سے تاریخی اسباب ایسے فراہم ہو گئے تھے کہ جنھوں نے نہ صرف ان کو استادی کے مرتبہ پر پہنچایا بلکہ ایک ادب ساز شخصیت بنا دیا۔ جس کی گرفت اور اثر اب بھی کسی نہ کسی شکل میں باقی ہے۔ نیا رنگ اور نئے اسکول کی بنا ڈالنے میں بہت سے اسباب ناسخ کے معاون ہوے۔ وہ لکھنؤ کی خالص پیداوار تھے ان کا نسلی یا کسی استاد کے واسطے سے ادبی سلسلہ دہلی تک نہیں پہنچتا تھا اس لیے ان میں تقلید دہلی کے لیے کوئی میلان نہیں موجود تھا۔ انھوں نے طویل عرصہ تک ادبی ریاضت اور زبان و بیان کے مسائل پر غور و فکر میں وقت گزارا۔ ان کا غور و فکر بھی

تقلیدی نہیں تھا اس لیے کہ کسی کے شاگرد نہ تھے بلکہ آزادانہ تھا ان کی مالی حالت بہت اچھی تھی اس لیے سن رسیدہ حالات گزیدہ اور ادب کے جہاں دیدہ شاعروں اور فنکاروں کو وہ اپنے پاس جمع رکھتے تھے اور سلوک مہربانی اور شریف پروری کے نہایت اخلاقی معیاروں کے مطابق ان کی خبر گیری رکھتے تھے نتیجہ میں ان گم نام اور فراموش شدہ فنکاروں نے زبان وفن کے متعلق اپنے مدت العمر کے تجربات اور معلومات کا خزانہ رفتہ رفتہ ان کے سامنے اُگل دیا آج ان کا کوئی نام بھی نہیں جانتا ہے مگر ناسخ کا چراغ روشن کرنے میں ان کے خون جگر نے کام دیا اور انھیں ذرّہ سے آفتاب نصف النہار بنانے میں نہ معلوم کتنے کواکب وانجم کا خون شامل ہوا۔ ان باتوں کے علاوہ ناسخ اپنی سماجی حیثیت بلند رکھنے سے بھی کبھی غافل نہیں ہوئے ان کا کمال یہ تھا کہ نہ وہ شاہی دربار کا چکر لگاتے تھے نہ امراء کے دسترخوان پر حاضری دیتے تھے، نہ مالداروں کی خوشامد اور چاپلوسی کرتے تھے بلکہ یک گونہ کم آمیز اور انتہائی غیور تھے پھر بھی کچھ شاعری کے طفیل میں اور کچھ اس عہد کی سیاست میں بلاارادہ ملوث ہونے کی وجہ سے ان کے روابط اور سماجی اثر ونفوذ میں غیر معمولی اضافہ ہوتا رہا وہ لکھنؤ سے برسوں جلاوطن رہے تکلیف انھیں جو کچھ بھی پہنچی ہو مگر انھیں حلقہ اثر بڑھانے، فنکاری کے زیادہ مدّاح پیدا کرنے اور اس نئی تحریک کو کہ جس کے وہ راہ نما تھے۔ زیادہ روشناس کرانے اور دل نشین بنانے کا خوب موقع ملا۔ یہ اسباب شاید ہی کبھی کسی شاعر کے لیے یکجا ہوئے ہوں ان تمام عوامل کے باوجود ابھی ایک بات کی کمی رہ گئی تھی اور وہ ایک حریف کی جو نبرد آزمائی کی پوری قوت رکھتا ہو، نئے ادبی رنگ کو اور چمکا سکتا ہو اور نئے ادبی مرکز کی بنیاد کو مزید مستحکم کر سکتا ہو اور باوجودِ ناسخ جو خلارہ گیا تھا اس کو اچھی طرح پورا کر سکتا ہو۔ یہ کمی آتش کے ظہور اور فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہونے پر پوری ہوگئی۔ آتش اور ناسخ آپس میں چاہے جتنے بڑے حریف رہے ہوں مگر لکھنؤ میں انفرادیت کی تلاش اور استقلال واستحکام کی جو تحریک چل رہی تھی اس میں اختلافات کے باوجود

یہ دونوں معاون تھے۔ ان کا راستہ ایک ہی تھا اور ان کی منزل بھی مشترک تھی اس لیے ایک بڑی تحریک کو کامیاب انجام تک پہنچانا اور اور آسودگئ منزل سے آشنا کرنا اور بالآخر لکھنؤ کو ایک آزاد مرکز بنانا ان ہی دوں فنکاروں کا کام تھا یہ ایک تاریخی فرض تھا کہ جس کو انھوں نے مشترک طور پر انجام دیا اور اس طرح حقیقتہً یہ دونوں شاعر عین اسی وقت نمودار ہوئے کہ جب فیصلہ کن مرحلہ طے کرنے کے لیے ان کی ضرورت بھی تھی اور انتظار بھی تھا۔

جب مصحفی اپنے تذکرہ ریاض الفصحا میں ان کا اندراج کر رہے تھے اور ان کی عمر 37 سال لکھ رہے تھے تو ناسخ ہنوز خود ابھرتے ہوئے اور اپنے رنگ خاص کو ابھارتے ہوئے شاعر تھے یہ بات تقریباً 9-1808ء کی ہے لیکن جلد ہی یعنی 18-1817ء سے پہلے ہی کہ جب انھوں نے اپنا دیوان اوّل مرتب کیا وہ استادی کے مرتبہ اور ادبی تخت حکومت پر بیٹھ چکے تھے اور اب ان کے پاس شاگردوں کی ایسی بھیڑ جمع ہو گئی تھی جس میں سماج کے ہر طبقہ کے لوگ شامل تھے جو ان کے اثر اور گیرائی میں روز افزوں توسیع کا باعث بنی۔ ان کے عروج نے اپنی انتہائی منزل تو عہد غازی الدین حیدر 29-1814ء میں چھوئی مگر ابھی سعادت علی خاں زندہ تھے (وفات 1814ء) کہ ان کی جبین سے استادی کے تیور نمایاں ہونا شروع ہو گئے تھے ابھی تک ان کا فروغ مرزا حاجی قمر کی وجہ سے زیادہ تر ہوا تھا اور اسی کے بعد سیاسی تغیرات کے ہاتھوں جن کا ذکر آ رہا ہے ان کے فروغ میں بہت سے امرا و شاہزادگان اور مرزا حاجی کے سخت حریف اور دشمن معتمد الدولہ آغا میر وغیرہ شامل ہوئے جو غازی الدین حیدر کے عہد میں زیادہ تر وزیر اعظم رہے۔ 1814ء سے پہلے ہی ان کی پوزیشن مستحکم ہو چکی تھی انھیں مصحفی اور دیگر اساتذہ کے پہلو میں جگہ ملنے لگی تھی۔ شعر و ادب کے مسائل میں ان کی طرف رجوع ہونے لگا تھا۔ اس درمیان میں انھوں نے چند ادبی معرکے بھی کامیابی کے ساتھ سر کیے اور بڑے بڑے استادوں کے مقابلہ میں

سرخرو ہوئے[1]

(۳)

اب تک ناسخ اطمینان وسکون کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے حسب معمول مرزا حاجی سے وابستہ تھے مگر اب وہ دور آگیا تھا کہ پریشانی اور اطمینان کے ملے جلے حالات کا وہ شکار ہوئے جس کا سبب ان کا کوئی ذاتی معاملہ یا قصور نہ تھا یہ سب کرامات اودھ کی بدلتی ہوئی سیاست اور اس کے عمل اور ردعمل کا نتیجہ تھے جس میں ناسخ کسی نہ کسی طرح ملوث ہوگئے تھے۔ اس موقع پر تاریخ اودھ، نجم الغنی، قیصر التواریخ، میر محمد زائر اور مفاتیح الریاست محمد رضا طباطبائی جو واقعات اودھ کے سلسلہ میں اہمیت رکھنے والے مآخذ ہیں اور اس کے علاوہ دیگر مورخین اور ان سے نقل در نقل کرنے والوں نے مجموعی طور پر واقعات کی صورت اتنی الجھادی ہے کہ صحیح اور مربوط صورت حال کا دریافت کرنا بہت مشکل ہوگیا ہے۔ جو کچھ قرین صحت وقیاس ہے وہ درج کیا جاتا ہے۔

حالات کا یہ اتار چڑھاؤ غازی الدین حیدر کی مسند نشینی سے شروع ہوتا ہے ۔

(1814ء) سعادت علی خاں کے آخری زمانہ میں یعنی 1229ھ سے پہلے کچھ امراء کا دربار اودھ میں بول بالا تھا ایک تو حکیم مہدی جو اپنی انتظامی صلاحیتوں کے لیے مشہور تھے اور مالیات اودھ کے بہت بڑے ٹھیکے دار بھی تھے۔ دوسرے مرزا جعفر اور ان کے بیٹے مرزا حاجی قمر امور سلطنت میں بے حد دخیل تھے اگرچہ کسی باضابطہ عہدے پر فائز نہ تھے۔ مگر غازی الدین حیدر کی تخت نشینی کے بعد مرزا جعفر یا مرزا حاجی کے وزیر ہونے کا پورا امکان موجود تھا اس لیے کہ یہ سلاطین اودھ اور انگریزوں کے مشترک معتمد تھے اور ان

---

[1] تفصیل کے لیے تذکرہ خوش معرکہ زیبا کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

دونوں نے غازی الدین حیدر کی تخت نشینی میں کہ جس میں اپنی سیاست کے مطابق انگریزوں نے کچھ دقتیں پیدا کردیں، بہت جانفشانی کی تھی اور انھیں تخت نشیں کروانے میں بڑی وفاداری سے خدمت کی تھی، اس کے بعد فطرتاً جوان سال مرزا حاجی قمر وزارت کے آرزومند تھے غازی الدین حیدر کی تخت نشینی کے بعد چند مہینوں تک یہ گویا وزیر رہے منصب تو باقاعدہ نہ ملا تھا مگر عملاً کار وزارت انجام دے رہے تھے اور خیال تھا کہ عنقریب باضابطہ تقرر ہو جائے گا، اسی زمانہ میں حکیم مہدی بھی وزارت کی امید لگائے ہوئے تھے مگر انھوں نے حالات کا اندازہ کر لیا تو لکھنؤ سے باہر نکل گئے۔ حالات نے خلاف توقع ایسا پلٹا کھایا کہ بے شان و گمان 1814ء ہی میں معتمد الدولہ آغا میر کو جو اس وقت تک لکھنؤ میں کسی نمایاں حیثیت کے مالک نہ تھے وزارت مل گئی، مرزا حاجی قمر خانہ نشیں ہو گئے ناسخ کی آغا میر سے واقفیت تو رہی ہوگی مگر کوئی ربط ضبط نہیں تھا۔ وہ مرزا حاجی کے ساتھ ان کے خراب دنوں میں بھی وابستہ رہے لیکن تقریباً ۹ مہینے کے بعد ایک دوسرا انقلاب یہ ہوا کہ آغا میر 1815ء میں وزارت سے معزول کر دئے گئے اور مرزا حاجی کا دوبارہ بول بالا ہوا۔ اب کی مرتبہ تو ناسخ ان کے مشیر خاص اور محرم راز ہی بن گئے تھے اور یہ یقین بھی ہو گیا تھا کہ اب کی ان کو وزارت ضرور ملے گی اس درمیان میں تدبّر کے ساتھ حکیم مہدی بھی ہاتھ پاؤں مارتے رہے اور اپنے لیے وزارت کی تدبیر کرتے رہے۔ ادھر معزول ہونے کے بعد بھی آغا میر دوبارہ وزیر ہونے کے لیے ہر طرح کے جوڑ توڑ کرتے رہے! اتفاق ایسا ہوا کہ بادشاہ بیگم جو غازی الدین حیدر کی ملکہ تھیں اگرچہ ان سے موافقت نہ تھی اور وہ علیٰحدہ مع اپنے کثیر عملہ اور قدرے فوج کے ساتھ بادشاہی طریقہ سے رہتی تھیں، ان کی سفارش آغا میر نے کسی صورت سے حاصل کر لی اور وہ کارگر بھی ہو گئی۔ جس کے نتیجہ میں آغا میر کچھ عرصہ معزول رہنے کے بعد 1817ء میں دوبارہ وزیر ہوئے اور جب اودھ کی نوابی 1819ء میں بادشاہی میں بدلی تو نائب السلطنت کے بجائے ان کا عہدہ

وزیر اعظم کا ہو گیا اب کی آغا میر جو وزیر ہوئے تو غازی الدین حیدر کے پورے عہد بھر اطمینان سے وزارت کرتے رہے۔ 1829ء میں جب غازی الدین کا انتقال ہوا تو نصیر الدین حیدر کے عہد میں ان کی معزولی اور پریشانیاں شروع ہوئیں۔ دوبارہ وزیر ہونے کے بعد آغا میر نے مرزا حاجی کو توخانہ قید کر دیا اور رفتہ رفتہ تشدّد کا حصار ان کے گرد مستحکم کرنا شروع کیا۔ اس زمانہ میں آغا میر کے تین خاص الخاص دشمن تھے (یا جن کو وہ اپنا دشمن سمجھتے تھے) حکیم مہدی، مرزا حاجی قمر اور جلد ہی ان کے ایک تیسرے دشمن پیدا ہو گئے اور وہ تھے میر فضل علی جو دہلی سے تعلق رکھنے والے ایک نہایت منتظم فرزانہ اور صاحب صلاحیت کارپرداز تھے وہ اس زمانہ میں بادشاہ بیگم کے یہاں آج کل کی اصطلاح کے مطابق چیف سیکریٹری کے عہدہ پر مامور تھے اور عملاً وزارت سے کمتر عہدہ کے مالک نہ تھے اس لیے کہ بادشاہ بیگم کی شان و شوکت ہی ایسی تھی۔ میر فضل علی شروع میں آغا میر کے خلاف نہ تھے مگر کچھ واقعات ایسے نمودار ہو گئے کہ دونوں میں سخت عناد پیدا ہو گیا ان تینوں افراد کی اہمیت یہ تھی کہ مرزا حاجی تو خیر حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے بعد میں کوئی منصب نہ حاصل کر سکے مگر میر فضل علی اور حکیم مہدی دونوں ہی غازی الدین حیدر کے بعد وزارت کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ آغا میر خطرہ کے پیش نظر ان سب کو لکھنؤ سے خارج کروانا یا قید کروانا یا مروا ڈالنا چاہتے تھے۔ ان کے خاص خاص وابستگان بھی آغا میر کی نظر میں تھے اور ان میں تقریباً سب ہی آغا میر کے ہاتھوں پریشانی میں مبتلا ہوئے۔ خدا بخش اور آفریں علی خاں لکھنؤ کے امرا میں تھے مگر آغا میر کے خلاف تھے یہ دونوں اور ان کے ایسے بہت سے اشخاص آغا میر کے عہد میں شکنجہ میں کسے گئے۔ اسی سلسلہ میں ناسخ بھی آغا میر کی نظر عتاب کا شکار ہوئے اس لیے کہ وہ اب بھی مرزا حاجی قمر سے خصوصیت و تقرب رکھتے تھے۔ اس عہد میں ناسخ بڑے مخمصے میں تھے وہ حالات کی حقیقت کو بھی سمجھتے تھے، آغا میر کا مزاج بھی جانتے تھے اور ہر طرف انھوں نے اپنے مخالفوں کی جو دھر پکڑ مچا رکھی تھی اس کا شکار ہونے والوں کا

عبرت انگیز انجام بھی ان کے سامنے تھا دوسری طرف وہ ایک باوضع اور وفادار انسان تھے ان میں غیرت کا مادّہ بھی بہت تھا اس لیے مرزا حاجی کو یک لخت چھوڑ دینا اور وہ بھی ان کے برے وقت میں ان کے لیے ممکن نہ تھا وہ مرزا حاجی کے یہاں بہر حال آتے جاتے رہے اور دوسری طرف آغا میر سے بھی اتنا ربط ضبط پیدا کرنے سے غافل نہیں ہوئے کہ جوان کے تحفظ کے لیے کافی ہو. آغا میر جب وزیر اعظم ہوئے تو جہاں انھوں نے بادشاہ ہونے پر غازی الدین حیدر کی شان میں قطعہ کہا وہیں آغا میر کی تعریف میں بھی کچھ اشعار نظم کیے مگر غالباً یہ سب بعد کے قصّے ہیں آغا میر نے دوبارہ منصب وزارت پر آتے ہی دوسرے لوگوں کی طرح ناسخ کو بھی شکنجہ میں کسنا چاہا چنانچہ غالباً (۱۸۱۶-۱۸۱۷ء) ہی میں انھوں نے ایک چوبدار اُن کے بلانے کے واسطے ان کے گھر بھیج دیا ناسخ اب تک گویا گوشہ نشیں ہو چکے تھے چوبدار کا آنا خطرے کی گھنٹی تھی۔ انھوں نے چوبدار کو بٹھایا کچھ خاطر مدارات کی اور کہا تم ٹھہرو جب تک میں پگڑی بندھواؤں اور سواری کا بندوبست کروں اس نے کہا تم اپنا انتظام کرو میں کوتوالی میں کہہ کے تمھارے واسطے سواری لے کر آتا ہوں ادھر چوبدار روانہ ہوا اور اِدھر یہ ایک چادر اوڑھ کر عین دوپہر میں آغا توکل کے پاس پہنچے اور کہا مجھے دو تین دن کے لیے چھپا لو تو میں موقع پا کر شہر سے نکل جاؤں انھوں نے کہا نواب (آغا میر) کا ظلم ظاہر ہے پتہ چل گیا تو میرا گھر مفت میں برباد ہوگا۔ انھوں نے کہا تو پھر ایک حجّام بلوا دو میں داڑھی مونچھ منڈا کر بیراگیوں کے لباس میں نکل جاؤں آغا توکل نے کہا اگر حجّام کہہ دے تو کیا ہوگا اب ناسخ یہ سمجھے کہ ان سے کام نکلنا ممکن نہیں اپنا تقرب بڑھانے کے لیے کہیں یہ خود ہی نہ خبر کر دیں اس درمیان میں چوبدار واپس آیا اور ناسخ کو غائب پا کر آغا میر کو جا کر خبر کی، آغا میر نے میر اسد کو حکم دیا کہ وہ شیخ صاحب کے گھر پر جا کر پکار آئیں کہ ناسخ کو تو بہر حال امان ہے مگر جس نے انھیں چھپایا ہوگا اس کی خیر نہیں ناسخ جب اس بات پر مطلع ہوئے تو آغا توکل کے یہاں سے اٹھ کر سیدھے میر اسد کے گھر پر پہنچے آغا توکل نے اپنا لڑکا ساتھ کر دیا تھا کہ کہیں یہ کسی اور طرف نہ نکل جائیں۔ میر اسد آغا میر کے قریبی

عزیز تھے شاعری کرتے تھے صبرؔ تخلص تھا اور ناسخؔ کے شاگرد تھے ناسخؔ نے ان سے رابطہ پیدا کرنا سودمند سمجھا اور وہ سودمند ثابت بھی ہوا دوپہر ہی کے وقت سراسیمگی کے عالم میں میر اسدؔ کی ڈھیوڑی پر پہنچے اور دربان سے کہا جاکے خبر کردے کہ ناسخؔ حاضر ہے۔ میر اسد سر و پا برہنہ دوڑتے ہوئے باہر آئے عزت سے لے جاکر مسند پر بٹھایا اور کہا کہ آپ اطمینان رکھیے میرا سر آپ کی عزت کے ساتھ ہے۔ آغا میر کو جاکر اطلاع دی انھوں نے کہا فی الحال اسے گھر میں رکھو دوسرے دن ناسخؔ اپنے گھر واپس آگئے مگر شاید انھیں خانہ نشین رہنے کا حکم اور لکھنؤ سے باہر نکلنے کی ممانعت کردی گئی تھی ممکن ہے آغا میر نے انھیں کام کا آدمی سمجھا ہو اور مرزا حاجی کا مقرّب ہونے کی وجہ سے مفید مطلب اطلاعات حاصل کرنے کا ذریعہ بھی۔ اس واقعہ کے بعد ناسخؔ اور بھی سمجھ گئے کہ آیندہ کیا ہونے والا ہے مرزا حاجی کے یہاں انھوں نے علانیہ جانا چھوڑ دیا مگر دلی ہمدری ان کے ساتھ بہر حال باقی رکھی اور وقتاً فوقتاً آغا میر کا غبار و کدورت اپنی جانب سے دور کرنے کے کوشش کی۔ حکیم مہدی بھی اس درمیان میں حالات کا جائزہ لینے کے لیے آتے رہے۔ مگر انھوں نے دیکھا کہ اب منفعت کے بجائے شامت ہی آنے والی ہے۔ ممکن ہے آغا میر انھیں حساب کتاب کے معاملات میں دھر لیں اور کم سے کم قید تو کرا ہی دیں گے آغا میر انھیں سب تدبیروں میں تھے مگر حکیم مہدی بھی کچھ کم نہ تھے وہ بیرون اودھ انگریزوں کی قوی حمایت رکھتے تھے انھوں نے ایسا انتظام کیا کہ لکھنؤ سے نکل گئے اور آغا میر ہاتھ ملتے رہ گئے حالانکہ حکیم مہدی آغا میر کی تدبیروں کو شکست دے کر لکھنؤ سے نکلے مگر ان کے مصاحبین نے ان کے نکلنے کو فرار قرار دیا اور اسے بھی آغا میر کے بڑھتے ہوئے اقبال کا نتیجہ ٹھہرایا۔ ناسخؔ کچھ نہ کچھ تقرب پیدا کرنے کی فکر میں تھے ہی انھوں نے لفظ 'گریختہ' سے تاریخ نکالی 1235ھ — 1819ء انھوں نے اسی ردیف کے ساتھ چند شعر بھی نظم کیے جن میں کا ایک شعر تاریخوں میں مل جاتا ہے محمّد خاں قوّال نے ان اشعار کو آغا میر

کے سامنے گایا اور انعام پایا۔

کاشوبرائے پختن شلغم گریختہ
رُوبہ صفت زہیبت ضیغم گریختہ

قیاس ہے کہ اس قطعہ کی وجہ سے ناسخ آغا میر سے کچھ نہ کچھ ضرور قریب آ گئے ہوں گے مگر اسی سال ناسخ پریشانیوں میں کچھ زیادہ دکھائی دیتے ہیں اسی سال وہ نزلہ اور بخار میں مبتلا ہوئے اور شاید بیماری نے طول پکڑا اچھے ہونے پر انھوں نے دو تاریخی قطعے کہے اسی سال ان کے چار خط چوری ہو گئے ان خطوط کا مضمون نہیں معلوم مگر خطرناک ضرور رہا ہوگا ممکن ہے ان کا تعلق کسی ایسی سیاسی سازش سے رہا ہو جو اس زمانہ میں بہت چل رہی تھی انھوں نے اس پر بھی دو تاریخی قطعات نظم کیے اور نہ صرف پریشانی کا اظہار کیا بلکہ خط چرانے والے کو بہت بددعائیں دیں۔ اسی سال ان پر ایک اور سخت واقعہ گزرا جو زیادہ پریشان کن تھا اس واقعہ کی بھی نوعیت نہیں معلوم ہوئی مگر قطعہ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ واقعہ سخت تھا۔ اشعار میں وہ کہتے ہیں کہ خدا کا شکر کہ میں قید ہونے اور قتل ہونے سے بچ گیا۔ گرفتاری اور قتل ہونے کا قصہ حکومتی ہی ہو سکتا ہے اگر ایسا ہے تو اس میں آغا میر کا دخل صاف صاف دکھائی دیتا ہے ممکن ہے کہ یہ تینوں واقعے ایک ہی ساتھ اور سال کیے ہوں اور ان میں باہمی ربط و تعلق ہو یعنی خطوط کا چوری ہونا، چوبدار کا گھر پر آنا اور بالآخر گرفتاری اور قید و قتل سے محفوظ رہنا۔ واقعات چاہے ایک دوسرے سے مربوط ہوں یا نہ ہوں اندازہ یہی ہوتا ہے کہ ابھی تک ان میں اور آغا میر میں اطمینان بخش تعلقات نہیں پیدا ہوئے تھے اسی سال کا واقعہ حکیم مہدی کا لکھنؤ سے نکلنا بھی ہے ممکن ہے کہ ناسخ نے ان واقعات کے بعد 'گریختہ' تاریخ کہہ کے آغا میر کو اپنی جان کی حفاظت کے لیے خوش کرنے کی تدبیر کی ہو۔ حکیم مہدی تو خیر ان کے ہاتھ سے نکل گئے مگر ابھی مرزا حاجی لکھنؤ میں موجود تھے۔

اور گھر میں مقید تھے اس حالت میں بھی ان کا لکھنؤ میں وجود آغا میر کے لیے دھڑکن کا باعث تھا وہ برابر غازی الدین حیدر سے ان کو جلاء وطن کرنے کی اجازت مانگتے تھے مگر جواب یہی ملتا تھا کہ رہنے دو گھر میں بیٹھا ہے تمھارا کیا بگڑتا ہے۔ یہیں سے دھیرے دھیرے ایک سازش ابھری جس میں ناسخ کا ملوث ہونا یقینی معلوم ہوتا ہے واقعات دو طرح بیان کیے جاتے ہیں۔ ایک عنوان تو یہ ہے کہ مرزا حاجی نے آغا میر کو قتل کرا دینے کا منصوبہ بنایا اور ایک برہمن یا راجپوت کو بہت سے انعام کا وعدہ کر کے اس کام پر راضی کیا اور طے یہ پایا کہ لکھنؤ کی ایک بارہ دری جہاں آغا میر ایک شادی میں شرکت کرنے والے تھے۔ وہیں انھیں موقع پا کر قتل کر دیا جائے۔ میر غلام علی رسالہ دار مرزا حاجی کے ایک مقرب خاص تھے یہ سارا کام انھیں کی خفیہ نگرانی میں انجام پانا تھا یہ بھی کہا گیا ہے کہ راجپوت یا برہمن کے بجائے میر غلام علی اس کام کے لیے مرزا حاجی کی طرف سے مقرر تھے۔ ناسخ اس بھید سے کسی نہ کسی طرح مطلع ہو گئے اور انھوں نے چپکے سے فقیر محمد خاں گویا کو جو اس عہد کے مشہور فوجی سردار، امیر کبیر، آغا میر کے خاص معتمد اور ناسخ کے اہم شاگردوں میں تھے، مطلع کر دیا۔ آغا میر اس شادی میں شریک ہوئے وہاں میر غلام علی رسالہ دار بھی مسلح موجود تھے۔ فقیر محمد خاں نے حفظ ماتقدم کے طور پر اس سے ہتھیار طلب کیے وہ راضی نہ ہوا تو فقیر محمد خاں نے طپنچہ کھینچ مارا غلام علی نے زخمی ہو کر فقیر محمد خاں کو تلوار ماری جس سے ان کا ہاتھ زخمی ہوا۔ غلام علی گرفتار ہوا تو اس کے بازو سے انعام موعود، دس ہزار روپیہ کی ہنڈی مہاجنی بطور تعویذ بندھی ہوئی ملی۔ معاملہ بادشاہ کے روبرو پیش ہوا ہنڈی دستاویزی ثبوت کے طور پر دکھائی گئی سازش کا الزام مرزا حاجی پر لگا۔ غلام علی کو عمر قید کی سزا ہوئی جس میں وہ مر گیا اور مرزا حاجی کو شہر بدر کرنے کا حکم ہوا۔ مگر شاید کسی وقت بعد میں۔

واقعہ کی دوسری نوعیت اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ یہ سب کھیل اور ڈراما خود آغا میر کا درست کیا ہوا تھا ایک مفلوک الحال سپاہی کو انعام کا وعدہ دے کر رات

کو بارہ دری میں بلایا گیا جہاں آغا میر موجود تھے اور ان کے درباری سب حلقہ باندھے مسلح اور چوکنا تھے اس سپاہی کے آتے ہی کسی پہلے سے مقرر شخص نے کہا، نواب کو تلوار مارو، وہ تلوار لگانا ہی چاہتا تھا کہ لوگ جھپٹ پڑے اور مار مار کر اس کا کچومر نکال دیا جب وہ نیم جان آغا میر کے پاس لایا گیا تو اس نے کہا مجھ سے دغا کی گئی اور مر گیا اس کے بازو سے ایک فرضی ہنڈی مہاجنی کھول کر مشہور کیا گیا کہ یہ انعامی وعدہ کی ہنڈی ہے اور ساری سازش مرزا حاجی کی ہے (بعض لوگوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس میں اور کچھ نہ تھا مٹھائی کا حساب لکھا ہوا تھا) اس جوڑ توڑ کی حقیقت سب پر واضح ہو گئی مگر آغا میر کے خوف سے کوئی دم نہ مار سکتا تھا مقدمہ بادشاہ کے یہاں پیش ہوا اور ناسخ اور میر غلام علی رسالہ دار کو بطور گواہ پیش کیا گیا۔ یہ صریحاً جھوٹی گواہی کا معاملہ تھا مگر چونکہ ناسخ مرزا حاجی کے مقربین میں رہ چکے تھے اس لیے انھیں ایک معتبر گواہ تصور کیا گیا۔ ناسخ کے لیے بڑا سخت مرحلہ تھا وہ گواہی کے لیے تو بہر حال گئے مگر پوچھ تاچھ پر جواب شاعرانہ دیا گویا مرزا حاجی کے ملوث ہونے کی تصدیق نہیں کی۔ میر غلام علی نے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ سب جعل سازی ہے۔ مگر آغا میر غازی الدین حیدر کو اس طرح یقین دلا چکے تھے کہ ناسخ کو تو گھر جانے کی اجازت مل گئی مگر میر غلام علی کو قید و بند میں جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ بہر حال مرزا حاجی کے اخراج کا حکم حاصل ہوا اور وہ بہت بے سر و سامانی میں اپنی تمام املاک و جائداد اور اسباب چھوڑ کر مع اپنے کنبے کے نکلے اور جس نے دیکھا حسرت سے نم دیدہ ہوا اسی عالم میں ان کے چھوٹے بھائی مرزا محسن نے تاریخ ہائے غریب سے نکالی جس سے (23-1822ء / 1238ھ) حاصل ہوتا ہے۔ ناسخ نے بھی ایک قطعہ تاریخ کہا جو کلیات میں موجود ہے اور اس سے انتہائی ہمدردی ظاہر ہوتی ہے۔

واقعات کی جو بھی نوعیت رہی ہو جزئیات پر کافی بحث کی جا سکتی ہے اس میں

فقیر محمد خاں کے ہاتھ کے زخمی ہونے کا ذکر بھی آتا ہے جس کی تاریخ ناسخ کے کلیات میں موجود ہے مگر وہ اس واقعہ کے احتمالی سنہ سے مطابق نہیں ہوتی۔ واقعات کی ترتیب اور سیاق وسباق میں کافی الجھنیں موجود ہیں مگر اتنی بات یقینی ہے کہ ناسخ اس میں کسی نہ کسی طرح ملوث تھے اور انھوں نے کچھ ایسی حکمتِ عملی سے کام لیا کہ آغا میر بھی زیادہ ناخوش نہ ہوئے ہوں گے یا اگر انھوں نے چپکے سے خبر پہنچادی تھی تو بہت خوش ہوگئے ہوں گے، اپنی جان بھی انھوں نے بچائی اور معاملہ کی نوعیت ایسی نہ ہونے دی کہ مرزا حاجی کی جان پر بن جاتی وہ صرف شہر بدر ہوئے اور انھیں اِن حالات میں ہونا ہی تھا۔

اب یوں سمجھنا چاہیے کہ دو کانٹے آغا میر کے پہلو سے نکل گئے پہلے حکیم مہدی اور پھر مرزا حاجی۔ اب تیسرا کانٹا یعنی میر فضل علی کا نکلنا باقی تھا اس میں بھی ناسخ دخیل نظر آتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ آغا میر کو دوبارہ وزارت بادشاہ بیگم کے توجہات سے ملی تھی مگر جلد ہی ان کے بادشاہ بیگم سے اختلافات پیدا ہونا شروع ہوئے اور انھوں نے بادشاہ بیگم کو مختلف طریقوں سے حیران و پریشان کرنا شروع کیا یہ بھی ایک سازش کا معاملہ تھا جس میں آغا میر نے ناسخ کو آلہ کار بنایا۔ جس کی وجہ سے کچھ سال تو ناسخ کے آغا میر کی مہربانیوں اور عنایتوں سے بہت اچھے گزرے مگر آئندہ چل کر خود ناسخ کے لیے جلاوطنی کی مصیبت کا آغاز اسی سبب سے ہوا اور وہ سالہا سال اسی چکر میں مبتلا رہے۔

ہوا یوں کہ آغا میر بادشاہ بیگم کی وجہ سے وزیر تو بن گئے مگر انھیں یہ دھڑکا ضرور رہا کہ یہی بیگم کسی دن ان کے زوال کا باعث بھی ہوسکتی ہیں۔ بادشاہ بیگم میں اور غازی الدین حیدر میں یوں بھی موافقت نہ تھی آغا میر نے پوری کوشش کی اور کامیاب بھی ہوئے کہ اختلاف کی خلیج کو ناقابل تلافی اور تدارک حد تک بڑھا دیا جائے اور بادشاہ بیگم کو مجبورِ محض کردیا جائے بادشاہ بیگم کے یہاں شاہی خاندان کے اہم بچّے

پرورش و تربیت پاتے تھے ان میں ایک تو نصیر الدین حیدر تھے جو غازی الدین حیدر کے بیٹے اور آیندہ اودھ کے بادشاہ ہونے والے تھے بادشاہ بیگم ان کی سوتیلی ماں تھیں۔ مگر سگی ماں کی طرح ان کی پرورش کرتی تھیں دوسرے محسن الدولہ جو غازی الدین حیدر کے نواسے تھے اور بعد میں اودھ کے بادشاہ ہونے والے محمد علی شاہ کے داماد بھی ہوئے۔ ان دونوں بچّوں کا بادشاہ بیگم کے پاس رہنا خانگی اور مملکتی نظام میں، ان کے لیے تقویت اور برتری کا باعث تھا۔ نظم و نسق اور دبدبہ قایم رکھنے میں ان کے مدارالمہام یعنی میر فضل علی بہترین صلاحیتوں کے شخص تھے آغا میر نے بہلا پھسلا کر اور مختلف تدبیروں سے نصیر الدین حیدر کو بادشاہ بیگم کے یہاں سے پہلے ہی نکال لیا اب سوال رہا محسن الدولہ کا اس کے لیے ناسخ آلہ کار بنائے گئے۔ ناسخ کے ایک دوست آخون انور علی محسن الدولہ کے استاد تھے انھیں ناسخ نے ہموار کیا انھوں نے محسن الدولہ کو مختلف باتیں سمجھا کر بادشاہ بیگم اور میر فضل علی کی سخت بندش اور تربیت سے چھٹکارا حاصل کر کے خود غازی الدین حیدر کے قرب میں رہنے اور نسبتہً آزادانہ زندگی بسر کرنے کے سبز باغ دکھائے۔ باتوں میں آکر محسن الدولہ نے ایک عرضی بادشاہ کی خدمت میں بھیج دی یہاں کیا دقت تھی عرضی منظور ہوئی اور آغا میر جو راہ پہلے ہی سے ہموار کر چکے تھے، انھوں نے نیلم والی کوٹھی آراستہ کرا کے محسن الدولہ کو وہاں منتقل کرا دیا اس سلسلہ میں بادشاہ بیگم سخت برہم رہیں اور میر فضل علی جو ریاست و سیاست کے سب نکتوں کو جانتے تھے پھڑپھڑاتے رہے مگر مجبوراً ہاتھ ملتے رہ گئے وہ نہ صرف ناسخ سے سخت خفا ہوئے اور مولوی انور علی کو موردِ عتاب بنایا بلکہ جو کدورت ان کے اور آغا میر کے درمیان باطناً چلی آرہی تھی اب ظاہر ہو گئی اور باہمی کشاکش کے بدترین نقشے سامنے آگئے۔ آغا میر نے ان شہزادگان کو اسی لیے علیحدہ کیا تھا کہ اس کے بعد میر فضل علی کا اخراج آسان ہو جائے گا چنانچہ (1822-23ء/1238ھ) ہی میں مرزا حاجی بھی نکالے گئے اور میر فضل علی بھی لکھنؤ سے باہر کیے گئے اور مولوی انور علی بھی کہیں

ہاتھی پر جارہے تھے کہ راستہ میں گر کر ہلاک ہوئے ان مسلسل کارسازیوں کی وجہ سے اور بالخصوص مرزا حاجی کے لکھنؤ سے چلے جانے کے بعد اب ناسخ بغیر کسی تکلّف کے آغا میر کے ساتھ ہو گئے ہر چند کہ اپنی خودداری کی وجہ سے درباداری نہیں کرتے تھے، مصاحبین کے زمرہ میں نہیں داخل ہوئے درباری لباس اور حاضری سے اپنے کو علیٰحدہ ہی رکھا مگر وابستہ رہے انھیں سے آغا میر کچھ شاعری بھی کر لیتے تھے چنانچہ ناسخ کے شاگرد ہو گئے اور غالباً ان کا سو روپیہ مہینہ بھی مقرر کر دیا ناسخ نے بھی 63 اشعار پر مشتمل ایک زوردار قصیدہ سا صنعت توشیح میں آغا میر کے لیے نظم کیا جو مطبوعہ کلیات میں تو موجود نہیں ہے مگر مخطوطات میں مل جاتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسی قصیدہ پر آغا میر نے ان کو سوا لاکھ روپے کا انعام دیا جو انھوں نے اپنے دوست مرزائی صاحب کے پاس رکھوا دیا۔ چوروں نے اسی آمدنی یا کسی دوسری آمدنی پر مطلع ہو کر ان کے یہاں نقب بھی لگائی اور محروم واپس گئے۔ ناسخ اب آغا میر کے علاوہ محسن الدولہ ایسے اہم امیر کبیر کی حمایت حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے یہ حمایت بعد میں جب ان کے حالات خراب ہوئے تو ان کے بہت کام آئی انھوں نے محسن الدولہ کے لیے بہت سے مدحیہ قطعات کہے اور جب وہ تقریباً پانچ سال لکھنؤ سے باہر رہے تو برابر محسن الدولہ کے لیے (وفات 1877ء) مدحیہ قطعات بھیجتے رہے۔ محسن الدولہ کی بدولت وہ لکھنؤ سے خود اپنے اخراج کو تو نہ رکوا سکے مگر اپنی حمایت کا ایک مضبوط وسیلہ لکھنؤ میں چھوڑ گئے جس سے ان کی پریشانیاں کچھ کم رہیں اور لکھنؤ میں، موقع ملنے پر، آنا ان کے لیے زیادہ مشکل نہ رہا۔

۴

ناسخ نے لکھنؤ میں چھ سات سال بڑی یکسوئی، فراغت اور اطمینان کے ساتھ گزارے ۱۸۲۱ء سے ۱۸۲۷ء تک کوئی ایسا خاص واقعہ نمودار نہیں ہوا جو خصوصی طور پر قابل ذکر ہو غازی الدین حیدر کی بادشاہت تھی اور آغا میر کی حاتم کو شرمندہ کرنے والی سخاوت، آغا میر بھی چین سے تھے اس لیے کہ ان کا ہر ہر دشمن جس سے وہ خطرہ محسوس کرتے تھے لکھنؤ سے باہر تھا۔ بڑے بڑے فنکار اور قدیم و درمیانی نسل کے زیادہ تر شاعر دنیا سے رخصت ہو چکے تھے تہذیبی اور تمدنی اعتبار سے بھی اور ادبی اعتبار سے بھی لکھنؤ کی انفرادیت مسلم ہو چکی تھی ناسخ مالی اعتبار سے بھی خوب آسودہ تھے سماجی حیثیت بھی قابل رشک حد تک بلند ہو چکی تھی اور زبان و شعر کے مسائل پر ان کے فیصلے بالعموم بے چون و چرا تسلیم کیے جاتے تھے خود ان کی شاعری بھی مقبولیت کے اعتبار سے نقطۂ عروج پر پہنچ چکی تھی۔ ان کی پوری زندگی کا نہایت کامیاب اور زرّیں دور گزر رہا تھا مگر چھ سات برس پلک جھپکتے میں گزر گئے اور اب سیاست کی نئی کرشمہ سازیوں نے ناسخ کو ایک عرصہ تک اپنے مربیوں سمیت جان فرسا حالات مبتلا رکھا۔ ناسخ کا دور ابتلا و پریشانی حقیقتاً اب شروع ہوا جس کی داستان طولانی بھی ہے اور عبرت خیز بھی۔

اکتوبر ۱۸۲۷ء میں غازی الدین حیدر کا انتقال ہوا اور نصیر الدین حیدر تخت حکومت پر بیٹھے۔ اس ردوبدل نے تغیرات کے ایسے ردعمل کو جنم دیا جس کی دھمک تقریباً ۱۰ سال چلتی رہی۔ آغا میر اور ناسخ دونوں ہی کے لیے غازی الدین کا مرنا ایک بہت بڑا سانحہ تھا ناسخ نے مصرعہ تاریخ نکالا۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ ۱۸۲۷ء - ۱۲۴۳ھ

یہ محض شاعری نہ تھی بلکہ ان کے لیے اوران کے مربی آغامیر کے لیے تلخ و تند حقیقت تھی اس مصرعہ کے مابین السطور جو کچھ موجود ہے اس کا آسانی سے اندازہ ہو جاتا ہے اور آئندہ کے واقعات سے باقاعدہ تصدیق بھی ہوتی ہے۔ نصیرالدین حیدر عہد شاہزادگی ہی سے آغامیر کے شاکی رہتے تھے۔ عام خیال بھی یہی تھا اور خود آغامیر کو بھی یقین تھا کہ اب ان کا منصب وزارت پر قایم رہنا ممکن نہیں ہے۔ انھوں نے نصیرالدین حیدر سے سبکدوشی کی اجازت بھی مانگی مگر خلاف امید وہ اتنی مہربانی اور شفقت سے پیش آئے کہ آغامیر حیرت زدہ رہ گئے اور پھر بالکل مطمئن ہو کر غافل بھی ہو گئے اور حسب معمول قدیم منصوبہ اور ولولہ کے ساتھ کار وزارت چلانے لگے۔ ادھر نصیرالدین کا مقصد انھیں سوائے خواب خرگوش میں مبتلا کرنے کے اور کچھ نہ تھا انھوں نے خفیہ طور پر اور جلد جلد ان کی معزولی کے انتظامات مکمل کرنا شروع کر دیے اور ریزیڈنٹ کی معرفت ہر بات طے کر لی اور چپکے سے میر فضل علی (وہی بادشاہ بیگم کے مدار المہام، ناسخ کے دشمن اور آغامیر کے نکلوائے ہوئے) کو وزارت عظمیٰ سونپنے کے لیے لکھنؤ بلوایا گیا۔ آغامیر کو ان کے خفیہ کارندوں نے لکھنؤ میں ان کی آمد کی خبر اور پوشیدہ بادشاہ بیگم کے یہاں ٹھہرنے کی اطلاع پہنچائی۔ اس خبر سے آغامیر کے کان کھڑے ہوئے مگر نصیرالدین نے انھیں پھر مغالطہ آمیز مہربانیوں سے مطمئن کر دیا۔ ابھی نصیرالدین کو تخت پر بیٹھے تین مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ ابتداے جنوری 1828ء میں ایک دن ریزیڈنٹ نے آغامیر کو طلب کیا اور معزولی کی اطلاع دے کر بتایا کہ اب آپ گرفتار ہیں، اور بالآخر یہ طے ہوا کہ وہ اپنے گھر پہرے میں جائیں اور تاحکم ثانی خانہ قید رہیں یہ حکم ثانی بھی کہیں برسوں میں نمودار ہوا اور سالہا سال آغامیر کو مرزا حاجی کی طرح خانہ قید رہنا پڑا۔ آغامیر کی معزولی کے ساتھ ہی میر فضل علی کو منصب وزارت دیا گیا اور اعتمادالدولہ کا خطاب ملا میر فضل علی کو نواب محسن الدولہ والے معاملہ میں ناسخ سے بڑی کدورت تھی اس کے علاوہ وہ اب آغامیر کے مقرب خاص بھی تھے۔ لہٰذا ناسخ بھی خانہ قید

کر دیے گئے انھوں نے اس موقع پر دو فارسی تاریخیں کہیں ایک میں اپنے اوپر بے حد ظلم وستم ہونے کا ذکر اور خانہ قید ہونے کی خبر دی ہے اور دوسری میں یہ بتایا ہے کہ جب میں خانہ قید ہوا تو ایک مرد بزرگ نے مجھے ایک بھیڑیے سے چھٹکارا دلوایا دونوں ہی تاریخیں عیسوی حساب سے 1828ء (1243ھ) کے مطابق ہیں گویا اسی سال میں وہ قید بھی ہوئے اور قید سے چھوٹے بھی یہ گرگ، تو بظاہر میر فضل کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ رہائی دلوانے والا مرد بزرگ گمان یہ ہے کہ شاید محسن الدولہ یا فقیر محمد خاں گویا ہوں۔ رہائی کے بعد چاہے ناسخ نے از خود لکھنؤ سے نکل جانے کا فیصلہ کیا ہو یا اسی شرط پر انھیں رہائی ملی ہو، یہ نہیں معلوم کہ انھوں نے کب لکھنؤ چھوڑا مگر 1828ء میں وہ لکھنؤ سے باہر دکھائی دیتے ہیں اس کا اندازہ ان قطعات تاریخ سے ہوتا ہے جو اسی سال انھوں نے الہ آباد میں نظم کیے تھے اور جو ان کے مطبوعہ کلیات موجود ہیں اندازہ یہ ہے کہ وہ جنوری کے آخر میں یا فروری 1828ء کے شروع میں لکھنؤ سے نکل گئے ہوں گے۔ ان کے مربی آغا میر ابھی لکھنؤ ہی میں تھے وہ چلتے وقت ان سے مل بھی نہ سکے ہوں گے اس طرح لکھنؤ سے ان کا پہلا نکلنا حتماً میر فضل علی کی وجہ سے ہوا۔ میر فضل علی زیادہ دنوں تک وزیر نہ رہ سکے ابھی وہ معزول نہ ہوئے تھے کہ 13 اپریل 1830ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد کوئی چھ سات مہینہ تک لکھنؤ کسی باضابطہ وزیر کے بغیر رہا۔ ناسخ کے لیے عالم جلاوطنی میں میر فضل علی کی خبر وفات ایک بشارت ثابت ہوئی ہو گی اور وہ حالات کا اندازہ لگا کر لکھنؤ پہنچنے کے لیے پر تول رہے ہوں گے، انھوں نے لکھنؤ سے معلومات حاصل کرنے کا مسلسل انتظام کر رکھا تھا مگر وہ لکھنؤ میں شاید اس لیے نہیں وارد ہوئے کہ میر فضل علی کی وفات کے بعد بھی ان کے مربی آغا میر ہنوز خانہ قید تھے نہ انھیں لکھنؤ سے باہر جانے کی اجازت ملی تھی اور نہ گھر سے باہر نکلنے کی ان حالات میں انھوں نے انتظار کرنا مناسب سمجھا ہو گا۔ مگر اس درمیان میں حالات نے مایوس کن پلٹا کھایا اور 7-6 مہینے ہی کے بعد نصیر الدین حیدر نے حکیم مہدی

کو بلاکر 9 نومبر 1830ء (17 جمادی الثانیہ 1246ھ) کو وزارت سونپ دی یہ وہی حکیم مہدی ہیں جن کا ذکر آچکا ہے جو آغا میر کے بھی بہت خلاف تھے اور جن کی ہجو ناسخ کہہ چکے تھے۔ یہ خبر ناسخ پر بجلی بن کر گری ہوگی اور لکھنؤ جانے کی سب امیدیں خاک میں مل گئی ہوں گی۔ اس لیے کہ حکیم مہدی ناسخ کے لیے عداوت میں میر فضل علی سے کچھ زیادہ ہی تھے۔ جس زمانہ میں میر فضل علی وزیر ہوئے تھے اس وقت بھی دراصل حکیم مہدی وزیر بننے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ بلکہ ایک طرح سے میر فضل ان کے ایجنٹ اور پیروکار کی حیثیت سے لکھنؤ پہنچے تھے، مگر وہ خود ہی وزیر ہوگئے۔ حکیم مہدی بھی اس عرصہ میں لکھنؤ پہنچے مگر اپنے لیے حالات سازگار نہ دیکھ کر وہ لکھنؤ چھوڑ کر چلے گئے۔ ناسخ اس زمانہ میں لکھنؤ سے باہر تھے پھر بھی انھوں نے حکیم مہدی کے لیے اپنی پرانی کہی ہوئی تاریخ میں معمولی سا تغیر کر کے دوبارہ ہجو یہ تاریخی فقرہ نکالا یعنی گریختہ کے بجائے اب 'بازگریختہ (دوبارا بھاگا) کہا اس سے 1295ھ برآمد ہوتے ہیں جو 29 – 1828ء کے مطابق ہے۔ بہرحال ناسخ صبر کر کے تن بتقدیر بیٹھ رہے۔ حکیم مہدی بھی اپنے سارے تدبّر اور مہارت کے باوجود نصیر الدین حیدر کے ساتھ زیادہ نہ چل سکے تقویم کے اعتبار سے وہ 29 اکتوبر 1832ء سے کچھ پہلے ہی معزول ہوئے اور لکھنؤ سے روانہ ہوگئے اور اب روشن الدولہ وزیر ہوئے۔ یہ واقعہ ہجری حساب سے 4 جمادی الثانیہ 1248ء سے کچھ قبل کا ہے اس لیے کہ اسی تاریخ کو روشن الدولہ کو وزارت ملی اب ناسخ خوش ہوئے ہوں گے اس لیے کہ حکیم مہدی ہی کے دور وزارت میں آغا میر بڑے جوڑ توڑ اور انگریزوں کی اعانت سے اپنا کروڑوں روپیہ کا اثاثہ لے کر کان پور پہنچ گئے اور لکھنؤ اور حکیم مہدی سے ان کو نجات ملی روشن الدولہ آغا میر کے سمدھی تھے اور ناسخ سے خود بھی ان کی دید شنید اچھی تھی چنانچہ اب میدان صاف پاکر روشن الدولہ کے وزیر ہونے کے کوئی ایک مہینہ کے بعد کان پور سے چل کر جہاں وہ لکھنؤ سے قریب رہ کر حالات کا اندازہ لگانے کے لیے اور اپنے مربّی آغا میر سے ملنے پہنچے ہوں گے، 26 نومبر 1832ء کو لکھنؤ پہنچ

گئے ان تاریخوں کا اندازہ اس قطعہ تاریخ سے لگایا گیا ہے کہ جوان کے شاگرد رشک نے ناسخ کے کان پور سے لکھنؤ روانہ ہونے کے سلسلہ میں کہا تھا یہ قطعہ کلیات رشک میں موجود ہے، خود رشک بھی اس زمانہ میں کان پور میں مقیم تھے اس طرح تقریباً پانچ سال کی مسلسل گردش کے بعد وہ لکھنؤ میں وارد ہوئے۔

لکھنؤ سے باہر ان کا زیادہ وقت الہ آباد میں گزرا وہ ادھر ادھر جاتے رہے مگر گھوم پھر کر الہ آباد آجاتے تھے جہاں دائرہ شاہ اجمل میں ان کا قیام تھا اور شاہ ابو المعالی کے خصوصی مہمان تھے وہ جہاں جہاں گئے شعر و ادب کا بیج بوتے گئے اور شاگرد بناتے گئے جس جگہ رہے گویا ایک دبستان کھل گیا اور اس طرح ان کی اصلاحی تحریک کا اثر خاصا پھیلا۔ ان کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بنارس جاکر شیخ حزین کے مزار کی زیارت کے بھی خواہش مند تھے کچھ لوگوں نے پٹنہ عظیم آباد تک بھی ان کے خط سفر کو پھیلایا ہے مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ وہ عظیم آباد اور بنارس پہنچے ہوں وہ قرب و جوار یا زیادہ تر اس زمانہ میں کانپور تک متعدد بار پہنچے اور پھر جلاوطنی کی صعوبتوں سے عاجز آکر الہ آباد میں مقیم ہو جاتے تھے۔

پھر پھر کے دائرہ ہی میں رکھتا ہوں قدم
آئی کہاں سے گردش پرکار پاؤں میں

لکھنؤ سے طویل عرصہ تک جدائی اور جلاوطنی ان کے لیے بے حد شاق رہی جس کا اندازہ ان کے ان اشعار سے ہوتا ہے جو انھوں نے عالم مسافرت میں کہے تھے ان کے شدید اشتیاق کا اندازہ اس شعر سے ہوتا ہے کہ جو دیوان دوم میں موجود ہے ؎

دشت سے کب وطن کو پہنچوں گا
کہ چھٹا اب تو سال آپہنچا ہے

لیکن ابھی چھٹا سال حقیقتاً پہنچا نہیں تھا کہ 'پیک فرخندہ فال' آگیا اور وہ لکھنؤ میں

وارد ہو گئے اگرچہ لکھنؤ ان کے لیے کچھ بدل سا گیا تھا پھر بھی پرانے روابط موجود تھے ۔ روشن الدولہ کی مہربانیاں شامل تھیں مالی پریشانی نہ تھی اب انھوں نے مشاعروں میں جانا بھی کم دیا تھا عام طور سے غزل لکھ بھیج دیتے تھے اور وہ بڑے اہتمام کے ساتھ پڑھ دی جاتی تھی ۔

جلاوطنی کا عہد بھی انھوں نے فنی ریاضت اور تخلیق کے نقطہ نظر سے ضایع نہیں کیا۔ شعر گوئی اور اصلاح کا سلسلہ برابر جاری رہا جدید شاگردوں کی تعداد بھی بہت تھی مگر ایسے میں کوئی پرانا شاگرد جیسے رشک کبھی الہ آباد پہنچ جاتا تھا تو خوشی کی کوئی حد نہیں ہوتی تھی۔ رشک کے کلیات میں متعدد اشعار نہیں بلکہ غزلیں ایسی ہیں جو الہ آباد میں کہی گئیں اور ایسے مشاعروں میں پڑھی گئیں جن میں ناسخ موجود تھے اتنے بڑے شاعر کا اتفاقات زمانہ سے لکھنؤ کے باہر پہنچنا اس زمانہ کے حساب سے ایک انہونی بات تھی ہر طرف قدر دانی ہوئی اور جگہ جگہ ان کے وجود و قیام کو ان سے استفادہ اور تسکین ذوق کا نادر موقع سمجھا گیا۔ ہر چند کہ جلاوطنی میں انھیں مختلف طرح کی تکلیفیں بھی پہنچیں مگر لوگوں کی مہمان نوازی اور قدر دانی نے تلافی کر دی اسی زمانہ میں مہاراجہ چندو لال نے ایک رقم خطیر کرایہ کے نام پر بھیجی اور حیدر آباد آنے کی درخواست کی جہاں غالباً ملک الشعرائی کا خطاب ان کا منتظر تھا مگر انھوں نے جانا گوارا نہ کیا بلکہ آصف جاہ دوم کے لیے ایک قطعہ تاریخ وفات نظم کیا اور یقیناً روانہ بھی کیا ہوگا کہ ان کی وفات کا حادثہ اس زمانہ میں تازہ تازہ تھا۔ اسی جلاوطنی کے عہد میں انھوں نے اپنا دوسرا دیوان بھی مرتب کیا جس میں یقیناً خود اسی دور کی غزلیں بہت رہی ہوں گی چونکہ یہ عہد اُن کی حیرانی اور پریشانی کا تھا اس لیے اس دیوان کا رنگ بھی پہلے دیوان کے مقابلہ کچھ مختلف ہے اس میں سنگلاخ فنی تراش کم ہے اور ایسے اشعار جو غم واندوہ حسرت اور مصیبت کے جذبات پر مشتمل ہوں اکثر دکھائی دے جاتے ہیں اسی لیے اس کا تاریخی نام انھوں نے 'دفتر پریشان' تجویز کیا ہوگا

جس سے (1832ء / 1248ھ) برآمد ہوتے ہیں الہ آباد اور کان پور میں وہ گنگا جمنا اور سنگم پر سیر و تفریح کرتے تھے۔ کان پور میں بھی گنگا کے کنارے ہوا خوری کے لیے اکثر جاتے تھے اس عہد کے کلام میں الہ آباد اور کانپور کا مقامی رنگ اکثر دکھائی دے جاتا ہے کان پور میں تو انھوں نے متعدد غزلیں ایسی کہیں کہ جن کا موضوع ہی گنگا ہے۔ انھوں نے گنگ و جمن کے ردیف و قافیہ سے اکثر اپنی غزلوں کو شاداب بنایا ہے یہ ان کی حب الوطنی کا ایک پہلو ہے۔ اودھ سے باہر انگریزوں کی حکومت تھی مگر باوجود لکھنؤ میں تکلیف اٹھانے میں ملک انگریز میں رہنا انھیں گوارا نہ تھا۔

دل ملک انگریز میں جینے سے تنگ ہے
رہنا بدیں میں روح کو قید فرنگ ہے

تمام تکلیفوں میں بھی وہ لکھنؤ اور اس کی الفت سے غافل نہیں رہے اگر لکھنؤ سے دوستوں کا خط آجاتا تو دل کی کلی کھل اٹھتی اس دردمند موضوع پر انھوں نے بہت سی رباعیاں اور قطعات کہے ہیں جو ہجر و شوق کی جان فرسا تکلیفوں کا اظہار کرتے ہیں اور لکھنؤ کی الفت کو ظاہر کرتے ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خود اپنے کلام کی شہادت کی وجہ سے اس عہد میں انھیں لکھنؤ کا سب سے بڑا عاشق قرار دینا چاہیے انھوں نے متعدد ایسی غزلیں بھی کہیں ہیں کہ جن کا موضوع ہی لکھنؤ ہے ان میں متعدد ایسی بھی ہیں کہ جن میں لکھنؤ کو ردیف بنایا گیا ہے۔

مرے دم سے تھا بوستاں لکھنؤ — مگر ہو گیا اب خزاں لکھنؤ
یہ اعلیٰ مرے لکھنؤ کی ہے شان — زمین ہے جہاں، آسماں لکھنؤ
الٰہی یہ ناسخ کی ہے التجا — مرے دم سے ہو شادماں لکھنؤ

آسماں کی کب ہے طاقت جو چھڑائے لکھنؤ — لکھنؤ مجھ پر فدا ہے میں فدائے لکھنؤ
بادشاہ لکھنؤ کی ہو بیاں کس سے شکوہ — ہاتھ میں رکھتے ہیں جام جم گدائے لکھنؤ

گل سے رنگین تر ہیں خار لکھنؤ　　نشہ سے بہتر ہے خمار لکھنؤ
ہم صفیر اپنا وطن ہے لکھنؤ　　ہم تو بلبل ہیں چمن ہے لکھنؤ

لکھنؤ کے قریب جلاوطنی کے بعد پہنچے تو جذبات اور تیز ہو گئے اور بے ساختہ ایک غزل کہہ ڈالی جو کافی متاثر کرتی ہے۔

دور او غربت، وطن نزدیک ہے　　مرغ جان خوش ہو چمن نزدیک ہے
کرد وضو ناسخ برائے فاتحہ　　روضۂ شاہ زمن نزدیک ہے

اس طرح پانچ سال کی جلاوطنی کے بعد وہ خوش و خرم لکھنؤ پہنچے ہر چند کہ روشن الدولہ کی وزارت تھی مگر وہ آغا میر والی بات کہاں بہر حال خیال یہی رہا ہوگا کہ اب چین سے وطن ہی میں رہنا نصیب ہوگا کہ تقدیر نے ایک کرشمہ اور دکھایا اور انھیں دوبارہ جلاوطن ہونا پڑا۔ 8 جولائی 1837ء کو نصیر الدین حیدر کا انتقال ہو گیا اور ان کی جگہ ہزار حیل وقال کے بعد محمد علی شاہ تخت سلطنت پر بیٹھے وہ بوڑھے ہو چکے تھے مگر امور مملکت کا اچھا تجربہ رکھتے تھے اس لیے کہ اپنے باپ سعادت علی خاں کے عہد میں کارگزار تھے اسی زمانہ میں ان کا اور حکیم مہدی کا بھی بہت ساتھ رہا تھا اور وہ حکیم مہدی کی لیاقت سے اچھی طرح واقف تھے انھوں نے بہت جلد روشن الدولہ کو معزول کیا اور حکیم مہدی کو فرخ آباد سے بلا کر 23 اکتوبر 1837ء کو وزیر بنا دیا اس انقلاب سے ناسخ پر جو گزری ہوگی وہ محتاج بیان نہیں ہے ان کا ایک قدیم دشمن وزیر ہو کر آ گیا۔ ابھی تک وہ حکیم مہدی کے شکنجہ میں نہیں آئے تھے اب بھی وہ لکھنؤ سے فوراً نہیں بھاگے شاید انھیں یہ امید رہی ہو کہ اہل تعارف امرا میں سے کوئی یا بالخصوص محسن الدولہ جو نئے بادشاہ کے داماد تھے بچا لیں گے۔ مگر کچھ بھی نہ ہوا شاید حکیم مہدی کے دل میں ناسخ کی نشتر دار ہجویں ابھی تک کھٹک رہی تھیں تفصیلات کا تو علم نہیں مگر زائر کے بیان کے مطابق (قیصر التواریخ 2/72) حکیم مہدی نے ایک چوبدار ناسخ کو بلانے کے لیے بھیج دیا۔ ناسخ نے چوبدار کو 15 روپے دئے جو اس زمانہ کے حساب سے ایک بڑی رقم تھی۔ ٹھنڈا شربت پلایا اور مٹھائی وغیرہ دی اور کہا کہ ٹھہرو میں پگڑی اور سواری کی فکر کر لوں تو چلتا ہوں۔ چوبدار بڈھا آدمی تھا شربت وغیرہ پی کر اسے نشہ

کی کیفیت پیدا ہوگئی اور وہ سوگیا ناسخ چپکے سے نکل کر آغا میر کے خاص آدمی اور خود اپنے شاگرد فقیر محمد خاں گویا کے یہاں پہنچے انھوں نے ایک میانہ میں زنانی سواری کے طور پر بٹھا کر اپنے علاقہ کول ہار (ملیح آباد) بھیج دیا وہاں سے کان پور پہنچے اور شاید الہ آباد پہنچ کر شاہ ابوالمعالی کے پھر مہمان ہوئے مگر اب کی الہ آباد پہنچنے کی بات یقینی نہیں ہے۔ کان پور میں مرزا محمد علی کے مہمان رہے شاید اس لیے کہ اب ان کے مربی آغا میر کا جو لکھنؤ سے نکل کر کان پور ہی میں مقیم تھے 7 مئی 1832ء کو انتقال ہو چکا تھا مگر اب کی ان کی قسمت میں زیادہ گردش نہیں لکھی تھی وہ لکھنؤ سے 23 اکتوبر 1837ء کے بعد جلد ہی کسی دن نکلے ہوں گے۔ جب کہ حکیم مہدی وزیر ہوئے مگر اب حکیم مہدی کا پیمانہ عمر خود لبریز ہو چکا تھا وہ 25 دسمبر 1837ء کو انتقال کر گئے۔ ناسخ کان پور سے بہت جلد لکھنؤ کے لیے روانہ ہوئے۔ رشک نے ایک قطعہ نظم کیا جس سے بہت سی تفصیل معلوم ہو جاتی ہے اور حساب لگانے پر لکھنؤ ان کا ورود 7 جنوری 1838ء قرار پاتا ہے۔ مرنے کے بعد بھی ناسخ نے حکیم مہدی کا پیچھا نہیں چھوڑا اور مصرعہ تاریخ کہا:

شب ولادت عیسیٰ بمرد ایں دجّال

جب وہ آغاز جنوری 1838ء میں دوسری مرتبہ چند ماہ کی جلاوطنی کے بعد لکھنؤ پہنچے تو چند ہی مہینے زندہ رہے مگر اطمینان سے رہے اور کسی مصیبت میں مبتلا ہوئے بغیر دن گزارتے رہے محمد علی شاہ کا زمانہ تھا اور اگرچہ لکھنؤ میں وہ بات نہ رہی تھی پھر بھی ان کا دل لگ رہا تھا محمد علی شاہ کے دربار میں ان کا رسوخ بھی کافی معلوم ہوتا ہے جو اس سے پہلے اور کسی بادشاہ کے دربار میں نہیں تھا انھوں نے چند ہی مہینوں میں محمد علی شاہ کے لیے مدحیہ اور مبارک باد کے قطعوں کا ڈھیر لگا دیا ان کے مطبوعہ کلیات میں جتنی کثرت کے ساتھ محمد علی شاہ کے لیے ان کے مدحیہ قطعات ہیں اتنے کسی دوسرے کے لیے نہیں ہیں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ان کا سو یا دو سو روپیہ ماہوار وظیفہ بھی مقرر کر دیا تھا اگرچہ اس کی تصدیق

معتبر ذرایع سے نہیں ہوتی ہے۔ انھیں محمد علی شاہ نے خلعت بھی دیا جس کا کسی دوسرے بادشاہ سے ملنا معلوم نہیں ہے۔

ناسخ دو مرتبہ جلاوطن ہوئے اور یہی تفصیل کہ جو بیان کی گئی ہے حقیقت سے قریب تر معلوم ہوتی ہے باقی اور جو بہت سی باتیں مختلف مآخذ میں درج ہیں وہ زیادہ تر قیاسی اور فرضی ہیں مثلاً غازی الدین حیدر کا قصیدہ کی فرمائش کرنا اور ملک الشعراء کا خطاب دینے کا وعدہ کرنا اور اس سلسلہ میں ان کا انکار اور آغا میر کا رائے دینا کہ آپ کچھ دنوں کے لیے باہر چلے جائیے محض افسانہ ہیں انھیں بادشاہ کی مدح سے انکار ہی کب تھا۔ انھوں نے غازی الدین حیدر کی تخت نشینی پر مدحیہ قطعہ کہا بھی تھا اور پھر غازی الدین حیدر کے عہد میں ہر ہر سال میں ان کے لکھنؤ میں رہنے کی شہادت اسی طرح دستیاب ہے جس طرح پہلی جلاوطنی کے وقت پانچ سال میں سے ہر ہر سال ان کے باہر رہنے کی شہادت موجود ہے ان کا تین چار مرتبہ لکھنؤ سے بھاگنا بھی درست نہیں ہے یا یہ کہ جب بھی حکیم مہدی کے آنے کی خبر مشہور ہوتی تو لوگ یہ دکھوا لیتے تھے کہ ناسخ گھر میں موجود ہیں یا نہیں اگر نہیں ہیں تو بس حکیم مہدی آگئے یا آنے والے ہیں اور اگر گھر میں ہیں تو حکیم کے آنے کی خبر غلط ہے یا یہ کہ ایک مرتبہ بھیس بدل کر کالوان رقی کی صورت بنا کر بم بم کرتے کانوڑ کندھے پر رکھے ہوئے نکل گئے اور جب محمد علی شاہ کو اس کی خبر پہنچی تو خوب ہنسے۔

(تذکرہ خوش معرکہ زیبا)

اور انھوں نے حکیم مہدی سے کہہ کر معافی کا شقہ لکھوایا اگر ایسا تھا تو انھیں حکیم مہدی کی زندگی ہی میں لکھنؤ آجانا چاہیے تھا یہ تمام باتیں افواہوں اور سنی سنائی خبروں پر موقوف معلوم ہوتی ہیں اگر ان کا اور تجزیہ کیا جائے تو ان کا جھوٹ اور بھی کھلتا ہی چلا جائے گا۔

جنوری 1838ء میں وہ جب لکھنؤ پہنچے تو ان کا دورا نخطاط تھا کہا جاتا ہے کہ وہ

فسادِ خون کے عرصہ سے مریض تھے ان کے بدنیت چچا نے میراث کے مقدمہ کے سلسلہ میں انھیں زہر دے دیا تھا اسی وقت سے یہ مرض تھا اور بیسن کی روٹی کھایا کرتے تھے۔ اس تھوڑے سے عرصہ میں بھی انھوں نے مشقِ سخن جاری رکھی اپنی مشہور مثنوی سراج نظم مکمل کی جس کی تفصیل آگے آرہی ہے اور محمد علی شاہ کو نذر دی۔ مگر ان پر عام انحطاط طاری رہا بیماری کی کوئی خاص تفصیل فراہم نہیں ہے ان کا آفتاب حیات لب بام آچکا تھا ان کے قریبی حلقہ کو بھی اس کا احساس ہو گیا تھا۔ آخر کو اسی مرض کہنہ کی شدت سے انھوں نے 15 اگست 1838ء کو انتقال کیا وقت انتقال نہیں معلوم جس مکان میں رہتے تھے (ٹکسال نزد چوک) اسی میں دفن ہوئے دفن کا انتظام و اہتمام مرزائی صاحب نے کیا جو ان کے قدیم دوست تھے اور از روئے وصیت ناسخ کے سارے متروکہ پر قابض و متصرف ہوئے۔ جس مکان میں دفن ہوئے وہ اب بھی موجود ہے مگر اب یہ مختصر اور معمولی مکان ہے ٹکسال والی گلی کے مغربی سرے پر یہ مکان واقع ہے جنوب کی جانب دالان کے مغربی سمت میں ایک کوٹھری ہے جس میں ان کی قبر بتائی جاتی ہے کوئی نشان قبر یا کتبہ موجود نہیں ہے کوٹھری رہائش کے کام میں آتی ہے۔ شاید ہی ان کا کوئی ایسا شاگرد ہو جس نے باوجود لیاقت ان کے مرنے کی تاریخ نہ کہی ہو رشک کی ایک تاریخ کا ذکر آچکا ہے جس سے مرنے کے دن، مہینہ اور سال نیز یہ کہ اس وقت کیا عمر تھی سب باتوں کا پتہ چل جاتا ہے۔ خود رشک نے اور دیگر شاگردوں نے تاریخوں کے گویا انبار لگا دیے اگر سب کو جمع کیا جائے تو ایک دیوان سا بن جائے ان تاریخوں میں ان کے کمالات کا ذکر بھی فراوانی سے ملتا ہے۔

اٹھا مرگ ناسخ کا غل چار سو سے — گیا لطف تحقیق کا گفتگو سے
کہا رشک نے مصرعِ سالِ رحلت — دلا شعر گوئی اٹھی لکھنؤ سے

(رشک)

ناسخ کہ بود اکمل بہ فن　　استاد با ارشاد ما
تاریخ گفتم اے قبول　　رفت از جہاں استاد ما

(قبول)

در شعر و سخن مثل نداشت　　فی الحقیقت ہمہ دان ناسخ بود
طرز نو کرد بعالم ایجاد　　ناسخ سحر بیان ناسخ بود
ختم شد شاعری ہند بر او　　خاتم اہل زبان ناسخ بود
سال تاریخ رضا موزوں کرد
آہ استاد جہاں ناسخ بود

(برق)

۵

ناسخ کے عادات و اطوار، سیرت و کردار کے متعلق بہت سے حقائق و لطائف آزاد نے آب حیات میں لکھے ہیں اور بہت کچھ متفرق طور پر دوسرے مآخذ میں موجود ہے۔ ان کی شخصیت میں سنجیدگی اور وقار کے ساتھ یک گونہ وحشت اور زود حسی کا مادہ موجود تھا۔ دوست نواز بھی تھے اور بے تکلف لوگوں سے بہت جلد گھبرا بھی اٹھتے تھے۔ نہایت غیور، مواسات اور خیرات کے شایق وضع دار اور عزت نفس کا خیال رکھنے والے تھے۔

ان کا گھر نہایت مرکزی جگہ پر واقع تھا بڑے بڑے امرا کی حویلیاں اور لکھنؤ کے شرفا اور دانشوروں کی قیام گاہیں نزدیک تھیں اس لیے ان کا گھر ایک دبستان بن گیا تھا جہاں ادیبوں اور صاحبان فن کی آمد و رفت بکثرت رہتی تھی وہ زندگی کے معمولات کے بھی پابند تھے اور مجمع احباب کے بھی خوگر، صبح ہوتے ہوتے وہ ورزش اور کسرت کے

تھکا دینے والے مشاغل سے فارغ ہو جاتے تھے۔ صبح اور سہ پہر کا وقت عام طور سے ملنے جلنے والوں کی نذر ہو جاتا تھا یا شاگردوں کے کلام پر اصلاح ہوتی رہتی تھی۔ عام طور سے رات کے وقت فکر سخن کرتے تھے، آداب محفل کا بہت خیال رکھتے تھے، تکیے سے لگے بیٹھے رہتے تھے، شاگرد جن میں اکثر امیر زادے اور عالی وقار شرفا بھی ہوتے تھے باادب بچھونے کے حاشیے پر بیٹھتے جاتے تھے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ ہوتی تھی۔ شیخ صاحب کچھ سوچتے، کچھ لکھتے پھر کسی شاگرد کی طرف مخاطب ہو کر 'ہوں' کہتے وہ غزل سنانا شروع کر دیتا۔ کسی شعر میں کوئی لفظ قابل تبدیل ہوتا یا پس و پیش سے کام نکل جاتا تو اصلاح کر دیتے نہیں تو کہہ دیتے یہ کچھ نہیں، نکال ڈالو یا اس کا پہلا یا دوسرا مصرعہ اچھا نہیں ہے اسے بدلو، یہ قافیہ خوب ہے۔ مگر اچھے پہلو سے نہیں بندھا ہے جب ایک شاگرد پڑھ چکتا تو دوسرا شروع کرتا۔

(آب حیات 336)

وہ کھانے کے بھی شوقین تھے جس طرح کا ڈیل ڈول تھا اور جیسی کسرت اور ورزش تھی ویسی ہی کھانے کی مقدار بھی تھی۔ انواع و اقسام کا کھانا پکواتے تھے اہل و عیال تو تھے نہیں سب انتظام مردانہ تھا، بازار سے بھی اکثر کچھ نہ کچھ منگوا لیتے تھے کھانا ایک ہی وقت یعنی دوپہر کو کھاتے تھے، عام طور سے تنہا کھاتے تھے جب جوٹھے باسن ملازم اٹھاتا تھا تو دو خوان بھر جاتے تھے کہا جاتا ہے کہ پانچ سر پختہ ایک وقت میں کھا لیتے تھے جو اُن کے ڈیل ڈول کو دیکھتے ہوئے کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ دوست احباب یا کوئی شاگرد بھی اگر کبھی کھانے میں شریک رہتا تو اصرار کر کے اسے بھی بہت کھلواتے تھے۔ ان کی بسیار خوری کی تصدیق سب ہی کرتے ہیں بلکہ لکھنؤ میں تو مشہور ہو گیا تھا کہ ان کے پیٹ میں جن سما گیا ہے۔ جلاوطنی کے عہد میں بھی جہاں پہنچے لوگوں نے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ الہ آباد میں سب سے زیادہ قیام کیا۔ وہاں مہمانی کا امیرانہ کھانا تین تین جگھوں سے حاضر کیا جاتا تھا پھر بھی اپنا باورچی خانہ خود بھی گرم رکھتے تھے اور جو جی چاہتا پکواتے تھے۔ فصل کی چیزوں اور میووں کا بھی شوق تھا کسی

چیز کو جی چاہا تو اس دن کھانا موقوف، جامنوں کو جی چاہا لگن اور سینیان بھر کر بیٹھ گئے۔ پسیری پھر وہی کھا ڈالیں، آم کو جی چاہا تو کئی ٹوکرے منگوا لیے ناندوں میں بھگوئے گئے اور خالی کر کے اٹھ گئے۔ بھٹوں کو دل چاہا تو گلیوں کے انبار لگا دیے۔ ایک مرتبہ کلب حسین خاں نادر نے جو صاحب علم اور خوش فکر شاعر تھے ڈپٹی کلکٹر تھے اور ناسخ کے شاگرد تھے انھیں انگریزی علاقہ سورام جہاں وہ مامور تھے مہمان بلایا اور بہت دنوں تک آداب ضیافت بجالائے۔ ایک دن ان کے لیے خاص طور سے کچھ عمدہ کھانے پکوائے جس کی وجہ سے معمول سے کچھ دیر ہوئی ناسخ نے دیکھا کہ نوکر اپنے اپنے کھانے لے کر ڈھیوڑی سے نکل رہے ہیں ان سب کو بلایا پوچھا کیا ہے انھوں نے کہا ہم اپنا کھانا لیے جا رہے ہیں کئی نوکروں کا کھانا رکھوا لیا اور کھا پی کر چاٹ پونچھ کے برتن حوالہ کیے اور کہا کہ جب ہمارا کھانا آئے تو تم کھا لینا نوکر جب تک نادر کو خبر کریں اور وہ آئیں یہاں سب قصہ ختم ہو چکا تھا۔ نادر کے بیٹے آغا کلب عابد خاں نے اس واقعہ کی تصدیق آزاد سے خود کی اور بتایا کہ ان کے مزاج میں کچھ شوریدگی ضرور تھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ کھاتے کھاتے ایک دم سالن کا پیالہ اٹھایا اور کھڑکی کے باہر پھینک دیا دیکھا گیا تو بظاہر کچھ نہ تھا۔ حقّہ کے بھی بہت شوقین تھے طرح طرح کے حقّے خود خریدتے تھے اور لوگ تحفۃً بھی دیتے تھے جب ان کی مخصوص صحبت احباب جمتی تھی تو ہر شخص کے لیے الگ الگ حقہ حاضر کیا جاتا تھا۔ ایک کوٹھری فقط حقّوں سے بھری رہتی تھی۔

یوں تو جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے انجمن آرائی اور مجمع احباب کے شائق تھے اور اس کے فوائد کو بھی خوب اچھی طرح جانتے تھے ؎

نہ ترک صحبت احباب کیجو ناسخ
گرا جو برگ شجر پایمال رہتا ہے

لیکن بعض وقت معمولی معمولی باتوں پر اُبل پڑتے تھے، کوئی صاحب ملاقات کو آئے

ہاتھ میں ایک چھڑی بھی تھی، قریب میں ایک مٹی کا ڈھیلا پڑا تھا شغل کے طور پر اسے آہستہ آہستہ توڑنے لگے۔ شیخ صاحب نے نوکر سے ایک ڈلیا بھر مٹی کے ڈھیلے منگوائے اور سامنے ڈلوا دیے اور کہا کہ اب اطمینان سے اپنا شوق پورا کیجیے، کبھی ایسا ہوتا کہ آنے والے اٹھنے کا نام ہی نہ لیتے اب اگر وہ کسی محویت کے عالم میں ہیں یا فکر سخن میں مصروف ہیں تو بس آناً فاناً ان کا پارا چڑھ جاتا۔ اسی طرح ایک صاحب آئے اور جب کسی طرح نہ اٹھے تو انھوں نے اپنے چھپر میں آگ لگوا دی وہ صاحب گھبرا کے اٹھے اور کہا دیکھیے کیا ہو رہا ہے۔ ناسخ نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا، اب کہاں چلے ہمیں اور تمھیں دونوں کو یہیں جل کے خاک ہونا ہے تم نے میرے مضامین کو خاک میں ملایا اب بھلا میں تمھیں جانے دوں گا۔ اسی طرح کوئی صاحب ٹلنے کا نام نہ لیتے تھے شیخ صاحب نے ملازم کو بلایا اور کہا صندوقچہ لے آؤ۔ اس میں سے مکان کا قبالہ اور کاغذات نکالے ان کے سامنے رکھ دیے اور کہا یہ مکان حاضر ہے نوکر سے کہا جلدی مزدور بلاؤ اور سامان اٹھوا کر لے چلو مکان پر تو ان کا قبضہ ہو ہی گیا ہے کہیں سامان بھی ہاتھ سے نہ جاتا رہے۔ ایک مرتبہ ان کے شاگرد میر اُنس ان سے ملنے پہنچے دیکھا کہ سارے صحن میں پانی بھروا دیا ہے بیچ میں ایک چوکی ہے اس پر بیٹھے ہیں جانے کا راستہ نہیں ہے اُنس نے سلام کیا دیکھ کر کہا آؤ۔ انھیں ہنسی آئی مگر ان کے رعب کے مارے روکے رہے اور کہا کہ حضور کیوں کر آؤں تمام تو پانی بھرا ہے کہاں ہاں، پھر اپنے ملازم صلابت کو آواز دی ایک پیڑا منگوایا۔ اُنس اس پیڑے پر ہو کر چوکی پر پہنچے پھر وہ پیڑا فوراً ہٹوا دیا اور کہا لوگ آتے تو ہیں چوک کی سیر کو جب جی بھر گیا تو کہا اب چلو ناسخ کے شعر سنیں نہ سمجھتے نہ بوجھتے دماغ پریشان کرتے ہیں میں نے ایسے ہی لوگوں کے لیے یہ ترکیب نکالی ہے۔

عام طور سے اپنے اشعار خود نہیں سناتے تھے مگر شائقین پہنچتے رہتے تھے اور فرمایش کرتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی دیوان سامنے رکھ دیتے تھے کہ ملاحظہ کر لیجیے اس کے

علاوہ انھوں نے چند مہمل شعر بھی جوڑ رکھے تھے پہلے انھیں سنا دیتے تھے اگر سننے والا تعریف اور واہ واہ کا شور مچا دیتا تو پھر چپ ہو جاتے ورنہ سخن فہمی کا اندازہ کر کے اپنا کلام سنا دیتے۔

وہ بذات خود اور عام حالات میں خوش اخلاق اور انسانی ہمدردی کا جذبہ رکھنے والے انسان تھے مگر ان پر کبھی کبھی خیالات میں محویت اتنی مسلط رہتی تھی یا اندرونی طور پر شاید زود حسی کی وجہ سے مزاجی کیفیت ایسی برہم رہتی تھی کہ ایسے میں ناواقف شخص انھیں مغرور یا بد دماغ بھی تصوّر کر سکتا تھا حالاں کہ حقیقت یہ نہ تھی۔ مہدی حسین فراغ اس زمانہ میں لکھنؤ کے اچھّے شاعروں بلکہ استادوں میں شمار ہوتے تھے ایک مرتبہ ان کے گھر پہنچے ناسخ نے گرج کر پوچھا 'کہیے صاحب کیسے تشریف لانا ہوا'، انھوں نے فارسی کے کسی شعر کا مطلب پوچھا جواب دیا میں فارسی کا شاعر نہیں ہوں اور پھر کسی شخص سے باتیں کرنے لگے۔ وہ بے چارے پچھتاتے ہوئے واپس ہوئے۔ آزاد کا بیان ہے کہ مرزا دبیر (جنھوں نے بعد میں مرثیہ نگاری میں بڑا نام پیدا کیا عہد ناسخ ہی میں ایک بالیاقت شاعر تسلیم کیے جاتے تھے) ایک مرتبہ ناسخ کے یہاں گئے ان کو اپنے استاد (غالباً ضمیر) کی کوئی اصلاح پسند نہ آئی تھی، اپنے شعر اور استاد کی اصلاح کا ذکر کیا ناسخ نے کہا کہ استاد کا بنایا ہوا درست ہے دبیر نے کہا کہ کتابوں میں تو اس طرح آیا ہے (جیسا میں نے نظم کیا) انھوں نے پھر کہا جو تمھارے استاد نے بنایا ہے وہی درست ہے۔ مرزا دبیر نے کہا حضرت آپ کتاب کو ملاحظہ تو فرمائیں بس یہ سننا تھا کہ ناسخ جھنجھلا اٹھے ایک چھڑی سامنے رکھی تھی وہ لے کر جھپٹے اور کہا تو کتاب کو کیا جانے ہمارے سامنے کتاب کا نام لیتا ہے، کتابیں دیکھتے دیکھتے ہم خود کتاب ہو گئے ہیں۔ مرزا دبیر نے فرار ہی ہو جانے میں اپنی عافیت سمجھی۔

بظاہر وہ سخت معلوم ہوتے تھے مگر ہمدردی اور رحم کا جذبہ دل میں بہت رکھتے تھے لوگوں کے ساتھ سلوک کرنے میں کبھی دریغ نہیں کرتے تھے کسی کی مصیبت میں کام

آنے سے پہلو تہی نہیں کرتے تھے۔ جس کی تصدیق ان کی زندگی کے چند معتبر واقعات سے ہوتی ہے بعض واقعات کا راوی سعادت خان ناصرؔ (تذکرہ خوش معرکہ زیبا کا مولف) جو اُن سے ہمدردی نہیں رکھتا ہے اور موقع پڑنے پر ہجو یہ نکتہ چینی سے باز نہیں رہتا اسی کا بیان ہے کہ محمد عیسی تنہاؔ بیمار پڑے تو ان کی عسرت کی خبر پاکر ناسخ نے انھیں دو سو روپے بھیجے۔ وہی یہ بھی بیان کرتا ہے کہ میر تقی میر کا انتقال ہوا تو ان کے دفن کفن کے مصارف ناسخ نے برداشت کیے اسی طرح 1833ء میں نہ معلوم کیا اتفاق ہوا۔ شاید اسی جھنجھلاہٹ کے نتیجہ میں کہ جوان پر طاری ہو جاتی تھی انھوں نے دو بندر مار ڈالے۔ غصّہ میں یہ کام تو کر بیٹھے مگر بعد میں شدید ندامت اور افسوس میں مبتلا ہوے اور اسی سلسلہ میں فارسی کا ایک نسبتاً طولانی قطعہ نظم کیا جس میں اس ظلم پر بڑی شرمندگی کا اظہار کیا اور گڑگڑا کر خدا سے معافی مانگی اور توبہ کی اور رسول خداؐ اور ائمہ طاہرین کا واسطہ دے کر طالب عفو ہوئے یہ قطعہ مطبوعہ کلیات میں نہیں ہے مخطوطہ (مخطوطۂ جان پالمر لکھنؤ یونی ورسٹی) میں مل جاتا ہے۔

ان کی طبیعت میں استغناء اور خودداری کا مادّہ بھی بہت تھا کسی کا احسان لینا امکان بھر گوارا نہیں تھا۔ شروع میں وہ مرزا حاجی قمر سے وابستہ تھے جب ان پر برا وقت پڑا تو خطرہ مول لے کر عرصہ تک ان سے میل ملت برقرار رکھی بعد میں وہ آغا میر سے وابستہ ہوئے مگر خودداری کے ساتھ اور وہ بھی مرزا حاجی کے لکھنؤ سے نکل جانے کے بعد۔ انھوں نے آغا میر کے عروج کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا اور ان سے کترانے میں جو خطرات تھے ان کو اچھی طرح سمجھتے تھے انھوں نے درباداری نہیں کی ایک قصیدہ ان کے لیے ضرور کہا مگر آغا میر کے سلوک اور مسلسل احسان کے مقابلہ میں وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ حالاں کہ ان کی طبیعت قصیدہ سے مناسبت رکھتی تھی اور قصیدہ نگاری کا اس عہد میں رواج بھی بہت تھا انھیں مواقع بھی خوب حاصل ہوئے انھوں نے تقریباً چھ حکمرانوں کا زمانہ بخوبی دیکھا مگر ہمیں وہ اودھ کے دربار میں قصیدہ پڑھتے اور پیش کرتے ہوئے کبھی دکھائی نہیں دیے وہ حکمرانوں

اور دیگر امرار کے لیے مختصر قطعات کہہ دیتے تھے اور بس، انھیں دربار اودھ سے کسی زیادہ مالی منفعت حاصل ہونے کی بھی کوئی اطلاع تاریخوں میں نہیں ملتی ہے، انھوں نے آخر عمر میں سب سے زیادہ قطعات محمد علی شاہ کے لیے کہے جن سے انھیں خلعت ملنا تو معلوم ہے مگر ماہانہ ملنا جس کا ذکر بعض تذکروں میں موجود ہے معتبر ذرایع سے ثابت نہیں اور اگر کچھ ملا ہو تو بھی صرف چند مہینوں کے لیے ملا ہوگا اس لیے کہ محمد علی شاہ کے عہد میں وہ جلاوطنی سے لکھنؤ واپس آکر بہت کم زندہ رہے۔

انھوں نے ہجوگوئی کا مشغلہ کبھی نہیں اختیار کیا اگرچہ اس زمانہ میں ادبی اور ذاتی معرکہ آرائیوں میں ہجو نگاری کا بہت رواج تھا۔ بہت سے لوگوں نے ان کی ہجویں کہیں آتش اور ان کے بعض شاگردوں نے ان پر خوب خوب چوٹیں کیں۔ حسین علی تاسف نے ان کی ہجو نگاری میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ ان پر مختلف قسم کے الزامات بھی لگائے گئے ادبی بھی اور ذاتی بھی مگر انھوں نے شاذونادر ایک آدھ قطعہ یا دو چار شعر جن میں ادبی چاشنی بھی موجود ہوتی تھی، کہہ کر قصہ تمام کر دیا۔ گستاخ لوگ ان پر دم کٹے بھینسے کی پھبتی کستے تھے اور ان کے سیاہ رنگ کی مناسبت سے ہجویں کہتے تھے۔ آتش نے ان پر ایک مرتبہ چوٹ کی ؎

روسیہ دشمن کا یوں پاپوش سے کیجیے فگار
جیسے سلہٹ کی سپر پر زخم ہو شمشیر کا

فقر محمد خاں گویا نے جو ان کے شاگرد تھے جواب لکھا ؎

ہے یقین گل ہو جو دیکھے گیسوے دلبر چراغ
آگے کالے کے بھلا روشن رہے کیونکر چراغ

خود ناسخ نے بھی جواب لکھا اور سچ تو یہ ہے کہ خوب لکھا اور اب تو قریب قریب ضرب المثل ہو چکا ہے ؎

میں گو کہ حسن سے ظاہر میں مثل ماہ نہیں
ہزار شکر کہ باطن مرا سیاہ نہیں

غلامی وغیرہ کا الزام ان پر برابر لگتا رہا خود آتش نے بھی ایک شعر میں چوٹ کی ؎

یہ بزم وہ ہے کہ لاخیر کا مقام نہیں
ہمارے گنجفہ میں بازیٔ غلام نہیں

ناسخ کے کسی شاگرد نے جواب لکھا ؎

جو خاص بندے ہیں وہ بندۂ عوام نہیں
ہزار بار جو یوسف بکے غلام نہیں

شیوہ رام شائق پہلے مصحفی کا پھر آتش کا شاگرد ہوا آتش نے ذرا توجہ سے اس کے کلام پر اصلاح دی اس نے ناسخ کو اس طرح منسوخ کرنے کا ارادہ کیا کہ ان کی ہر غزل کا جواب لکھنا شروع کیا ناسخ کو خبر پہنچی انھوں نے غزل کہی اور دو شعر یہ بھی نظم کر دیے ؎

کہہ رہا ہے ایک جاہل میرے دیوان کا جواب — بو مسیلمہ نے کہا تھا جیسے قرآں کا جواب
کیا کلیم اللہ سے نسبت ہے اس ناپاک کو — چاہیے فرعون کو دے اپنے ایمان کا جواب

خود ناسخ کے شاگردوں میں لالہ فتح چند شائق تخلص ایک شاعر موجود تھا ممکن ہے اس نے یہ تخلص ناسخ کے مشورہ سے رکھا ہو اور ناسخ نے شیوہ رام شائق کی سرکوبی کے لیے اسے تیار کیا ہو۔

ان واقعات سے اس گرمی کا اندازہ ہوتا ہے جو اس عہد میں موجود تھی مگر ناسخ کا رویہ عام طور سے بردباری اور حلم وضبط کا پابند رہا وہ تو ادبی بحثوں اور الزام واعتراض کے سلسلہ میں بھی اپنے شاگردوں کو جواب نہ دینے کا پابند رکھتے تھے اور جہاں تک ہو سکتا تھا معاملہ کو سکوت سے ٹال دیتے تھے۔ کم اشعار ان کے دیوان میں ایسے ہیں جن میں ہجو یا ہجو

ایمائیت ملتی ہو۔

کیا رقیب روسیہ ہے چیز ناسخ کے حضور
دب گئی آواز خر کی شیر کی آواز سے

کجی روز ازل سے طینت موذی میں داخل ہے
کیا خالق نے ساتھ افعی کے پیچ وخم پیدا

آگے افتادوں کے پاتے ہیں کہیں سرکش فروغ
سرد ہو جائے نہ کیوں بازار آتش آب سے

اس طرح کے مزید واقعات کے لیے آب حیات اور دیگر تذکروں کی طرف رجوع کرنا چاہیے

جہاں تک ان کے مذہب کا تعلق ہے بیرونی شہادت اور دیوان کی اندرونی شہادت کے مطابق وہ شیعہ اثنا عشری تھے۔ ان کا آبائی مذہب سنی تھا خود بھی وہ پہلے سنی ہی تھے اس کا علم نہیں کہ انھوں نے مذہب کب بدلا باپ کی وفات سے پہلے یا بعد میں ان کے تبدیل مذہب میں اس عہد کے عام مصالح کے علاوہ کاظم علی صالح سے قربت اور ان کے فیض صحبت کا اثر ہوسکتا ہے وہ اس زمانہ کے مشہور زاہدوں اور عالموں میں تھے یہ نہیں معلوم کہ ناسخ کا ان سے ابتدائی رابطہ کیوں کر قایم ہوا۔ مگر ناسخ نے ان سے دینی اور مذہبی استفادہ بہت کیا۔ انھیں کی فرمائش سے سراج نظم نامی مثنوی کہی وہ ان کے بے حد عقیدت مند تھے ان کی وفات پر 1833ء انھوں نے بکثرت تاریخیں نظم کیں جن سے عقیدت کا حال معلوم ہوتا ہے مرزا کاظم علی صالح ناسخ کے عزیز اور نمودار شاگرد برق کے والد تھے۔ ناسخ کے دیوان، مثنویات اور متفرق حالات سے علم ہوتا ہے کہ مذہب ان کے لیے محض رسمی معاملہ نہ تھا وہ ایک باخبر اور بابصیرت مذہبی انسان معلوم ہوتے ہیں مگر ان میں تعصب اور تنگ نظری نہ تھی وہ ایک وسیع المشرب انسان تھے اور ان کے سماجی دائرہ روابط میں اور شاگردوں میں بھی شیعہ، سنی اور ہندو سب ہی دکھائی دیتے ہیں اور بہت سے غیر شیعہ افراد کے ساتھ بھی ان کے روابط دوستی اور اتحاد قلبی کی حد تک پہنچے ہوئے تھے۔

۶

ناسخ کا سماجی حلقہ اور دائرہ روابط نہ صرف وسیع تھا بلکہ رنگارنگ بھی تھا وہ خود بڑے شاعر تھے اس لیے شاگردوں کی ایک فوج ان کے گرد جمع ہوگئی تھی جو سماج کے ہر طبقہ سے تعلق رکھتی تھی، ان کی سیاسی اہمیت بھی تھی اس لیے ان کے تعلقات بھی اسی مناسبت سے وسیع سے وسیع تر ہوتے گئے لکھنؤ کے بے شمار امرار سے ان کے قریبی روابط تھے رحم دل تھے اور کارسازی کا جذبہ رکھتے تھے اس لیے بھی اہل حاجت اور سفارش چاہنے والوں کا ان کے گرد ہجوم رہتا تھا پھر انھوں نے سالہا سال لکھنؤ سے باہر زندگی بسر کی اس لیے ان کا حلقہ اثر بیرون لکھنؤ تک پہنچا جن لوگوں سے وہ راہ و رسم رکھتے تھے ان کا شمار بہت مشکل ہے امرار، شہزادگان اہل دانش، صوفیار، علمار، مذہب، شعرار و ناقدان فن، تجار، حکمار، خطاط ان سب ہی طبقات کے نمودار لوگوں سے ان کے قریبی تعلقات تھے اور ان سب ہی طبقات میں ان کے شاگرد بھی پھیلے ہوئے تھے ان کی تفصیل لکھنے کے لیے ایک دفتر چاہیے۔

آتش ان کے مستقل حریف تھے اور دونوں کے شاگردوں کا حلقہ اتنا بڑا تھا کہ سخن گسترانہ باتوں اور ادبی ردّ و بدل سے شاید ہی کوئی دن خالی جاتا ہو آتش ایک نڈر، بے باک اور دنیاوی آلائشوں سے دست کش شخصیت رکھتے تھے وہ ناسخ کی طرح مصلحت بیں اور موقع شناس بھی نہ تھے اس لیے برابر ایسے موقع آتے رہتے تھے کہ اگر ناسخ سکوت، مصلحت بینی اور تدبر سے کام نہ لیتے تو بڑے بڑے جھگڑے برابر نمودار ہوتے رہتے اور دونوں کی داستان انشا اور مصحفی سے بھی زیادہ عبرت انگیز ہوتی۔ ان دونوں کے تعلقات کبھی خوشگوار نہیں رہے ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا بھی نہیں تھا اور ابتدائی عہد کے علاوہ دونوں ایک مشاعرہ میں جمع بھی بہت کم ہوتے تھے۔ آتش نے بارہا انھیں سر مشاعرہ اپنے اشعار کے ذریعہ طعن و طنز کا نشانہ بنایا

مگر ناسخ ہر مرتبہ طرح دے جاتے تھے۔ معاصرانہ چشمک کی بات اور ہے مگر اس بات کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ دونوں بحیثیت شاعر کے ایک دوسرے کو بُرا سمجھتے ہوں آتش کے متعلق تو ہمیں آب حیات ہی کے ذریعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ کی رائے میں انھوں نے محاورہ بندی میں نام نکالا تھا۔ خواجہ آتش کے سامنے بھی کسی نے ناسخ کا یہ شعر پڑھا ؎

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی
عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

تو انھوں نے لطف زبان کی تعریف کی مختلف مآخذ میں چند ایسے مشاعروں کا ذکر ملتا ہے جن میں دونوں کی معرکہ آرائیوں کا حال بہت مشہور ہوا۔ آغا میر نے ایک مرتبہ اپنے نو تعمیر محل میں مشاعرہ کیا مصرع طرح نکالا گیا۔ ناسخ تو خصوصی مدعوئین میں تھے باقی شہر کے سب ہی اچھے شعراء مدعو کیے گئے مگر کسی سازش یا غلط فہمی کی بنا پر آتش کو صرف ایک روز پہلے مصرع طرح پہنچا۔ انھوں نے کہا کہ شاید آغا میر کو ہمارا امتحان مقصود ہے جو عین وقت پر مصرع طرح بھیجا ہے خیر یوں تو ہم نہ جاتے یا جاتے مگر اب جانا ضروری ہے اپنی مخصوص سج دھج اور آن بان کے ساتھ شاگردوں کا ایک جم غفیر لیے ہوئے مشاعرے میں داخل ہوئے جب شمع سامنے آئی تو نئے مکان کی مناسبت سے انھوں نے یہ مطلع پڑھا ؎

یہ کس رشک مسیحا کا مکان ہے
زمین جس کی چہارم آسمان ہے

'موقع کے مطابق مطلع تھا اس لیے دشمن کے منھ سے بھی (ناسخ) واہ نکل گئی'۔

(آب بقا)

اس طرح کے ایک مشاعرہ کا ذکر آزاد نے بھی کیا ہے۔ ایک نواب صاحب کے یہاں مشاعرہ تھا جو ناسخ کے معتقد تھے انھوں نے ارادہ کیا کہ جب ناسخ غزل پڑھ لیں تو انھیں سر مشاعرہ خلعت دیں آتش کو اس وقت مصرع طرح پہنچا جب ایک دن مشاعرہ

کو باقی تھا بہت خفا ہوے اور کہا اب لکھنؤ رہنے کی جگہ نہیں رہی ہم نہ رہیں گے سب شاگرد جمع ہوے ہاتھ پاؤں جوڑ کے بہت سمجھایا مگر آتش اپنی تند مزاجی میں شہر سے باہر نکل گئے ایک مسجد میں جا بیٹھے اور پھر غزل کہہ کر لائے اور مشاعرہ میں اپنے شاگردوں کے ہمراہ پہنچے تو ایک قرابین (چھوٹی بندوق) بھی بھر کر لیتے گئے عین ناسخ کے سامنے بیٹھے بار بار قرابین اٹھاتے تھے اور رکھ دیتے تھے رعب داب ان کا بھی ایسا تھا کہ کوئی بول نہیں سکتا تھا جب شمع سامنے آئی تو اپنی وہ مشہور غزل پڑھی جو ان کے شاہکاروں میں شمار ہوتی ہے۔ سمان بندی کے علاوہ جو آتش کا خاص وصف ہے، ایسے اشعار پر مشتمل ہے جو ضرب المثل بن گئے ہیں یہاں مطلع درج ہے۔

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

ہر شعر میں ناسخ پر کسی نہ کسی صورت سے چوٹ ضرور کی۔ شیخ صاحب بے چارے دم بخود بیٹھے رہے نواب صاحب بھی ڈرے کہ کہیں قرابین نہ چلا دیں اور ناسخ یا نواب صاحب کی جان ہی چلی جائے اسی وقت داروغہ کو حکم دیا اور دونوں صاحبوں کو برابر کا خلعت دے کر رخصت کیا۔

نواب سیّد محمد رند عالی خاندان نواب اور صاحب دیوان شاعر اور آتش کے نہایت اہم شاگردوں میں محسوب ہوتے ہیں ایک مرتبہ کسی بات پر آتش سے رنجیدہ ہو کر ناسخ کے پاس شاگرد ہونے کے لیے پہنچے۔ ناسخ کے لیے آتش کو محجوب کرنے کا یہ اچھا موقع تھا مگر ناسخ میں جو عالی ظرفی اور شرافت کا مادہ تھا وہ آڑے آیا انھوں نے کہا آپ دس برس سے خواجہ صاحب سے اصلاح لیتے ہیں آج ان سے یہ حال ہے تو میں کیا امید کروں پھر شاید آپ ان کے ساتھ کچھ سلوک بھی کرتے ہوں گے وہ سلسلہ ختم ہو جائے گا تو وبال کس پر پڑے گا پھر برق سے جو رند کو لے کر آئے تھے کہا کہ آپ ہی دونوں میں صفائی کروا دیجئے اور اتنی تاکید کی کہ آخر کو صفائی ہو گئی۔

ناسخ کے انتقال کی خبر سنی تو بہت اثر ہوا کہا جاتا ہے کہ چیخ مار مار کر روئے اور اس کے بعد شعر گوئی ترک کر دی۔ ممکن ہے اس بیان میں مبالغہ ہو مگر جب حریف ہی نہ رہا تو شاعرانہ ولولے اور فکر سخن میں حریفانہ سرگرمیوں کا کم ہو جانا ایک طرح سے فطری بات ہے۔

ناسخ کے حلقہ ملاقات کی ایک اور اہم شخصیت کا ذکر خاص طور پر کر دینا مناسب ہوگا اور وہ ہیں غالب دہلوی۔ غالب جب اپنی پنشن کے معاملات طے کرنے کے لیے کلکتہ روانہ ہوئے تو 1827ء میں کچھ عرصہ کے لیے لکھنؤ میں بھی رکے وہ ناسخ کی اہمیت سے پہلے سے واقف تھے۔ ناسخ اس زمانہ میں لکھنؤ میں موجود تھے مگر ناسخ اور غالب کے درمیان ملاقات اور دید بازدید کا کوئی حوالہ کہیں دستیاب نہیں ہوا لیکن یہ بات ناممکنات میں سے معلوم ہوتی ہے کہ دونوں میں ملاقات نہ ہوئی ہو اس لیے اور بھی کہ غالب مالی فوائد کی کچھ امیدیں لے کر لکھنؤ پہنچے تھے بادشاہ تک پہنچنے کا زینہ آغا میر تھے جو اس زمانہ میں وزیر اعظم تھے ناسخ اور آغا میر کے تعلقات بھی اس وقت اچھے خاصے تھے اس لیے قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ غالب نے ناسخ کا وسیلہ تلاش کرنے میں کوئی کوتاہی کی ہوگی مگر غالب آغا میر سے ملاقات نہ کر سکے۔ اگر انھوں نے ناسخ کو ذریعہ نہیں بنایا تو تعجب کی بات ہے اور اگر ذریعہ بنایا اور پھر ملاقات نہ ہو سکی تو مزید تعجب کی بات ہے غالب نومبر 1829ء میں دہلی واپس پہنچے اس زمانہ میں ناسخ جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے کئی سال تک ناسخ اور غالب کے درمیان کسی رابطہ کا سراغ نہیں ملتا ہے لیکن غالب کی نظر لکھنؤ کی طرف مسلسل رہی بالآخر انھوں نے 2 اگست 1834ء کو اپنا مختصر دیوان اور ایک خط ناسخ کو لکھنؤ بھیجا اطلاعات کے مطابق یہی پہلا خط ہے جو انھوں نے ناسخ کو لکھا۔ دیوان کے ساتھ انھوں نے ناسخ کی تعریف و توصیف پر مشتمل ایک تحریر بھی شامل کی جس میں سے مبالغہ کا عنصر نکال دیا جائے تب بھی قابل توجہ حقیقت باقی رہ جاتی ہے ناسخ کے لیے

لکھتے ہیں کہ " درسخن طرح نوی ریختہ او است و در ریختہ نقش بدیع انگیختہ او۔"

اس کے بعد ان کے اور غالب کے درمیان مسلسل خط و کتابت کا پتہ چلتا ہے جس کا سلسلہ ناسخ کی وفات ہی پر ختم ہوا۔ ناسخ کے نام غالب کے متعدد خطوط ان کے کلیات نثر فارسی میں موجود ہیں جن میں کہیں کہیں ناسخ کی شاعری اور کمال کے متعلق غالب کی رائے جھلکتی ہے مگر ناسخ کی کوئی تحریر یا ان کا کوئی قول غالب کے متعلق دستیاب نہیں ہے۔ ناسخ نے جواب میں یا فرمائش پر اپنا دیوان بھی غالب کو بھیجا تھا جس کی رسید میں غالب یہ اظہار کرتے ہیں:

" قلزم معنیٰ را سفینہ است و جواہر مضمون را گنجینہ۔ سخن بروزگار مخدوم بپایۂ بلند رسید و اُردو را رونق دیگر پدید آمد۔"

غالب اپنے مالی مشکلات کے متعلق بھی ناسخ کو لکھتے رہتے تھے شاید اسی بنا پر ناسخ نے انھیں دکن جانے کا مشورہ بھی دیا تھا مگر انھوں نے یہ عذر لکھ دیا کہ جہاں قتیل کو استاد سمجھا جاتا ہو وہاں غالب کا کیا کام اور جہاں اُردو میں شاہ نصیر ایسے شاعر کی تعریف ہوتی ہو وہاں ناسخ کا کیا کام۔ غالب کے اوپر ایک مقدمہ کے سلسلہ میں ڈگری ہوئی تو ناسخ نے اس کا حال بھی ان سے دریافت کیا اور معلوم ہوتا ہے کہ خود یا اپنی سعی کو کام میں لاکر غالب کو کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور پہنچایا اس لیے کہ غالب ناسخ کو لکھتے ہیں:

" متاع مرا بایں ہمہ ناروائی خریدارے، و مرا بایں ہمہ ناکسی غم خوارے ــــــ بے خواست برزبان برآید کہ جان فدایش باد۔"

اس خاص سیاق و سباق میں ان فقروں کا جو مفہوم ہے وہ واضح ہے۔ ناسخ اور غالب کے درمیان فارسی خط و کتابت کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو اس میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ غالب ممنون کرم ہونے کی حد تک ناسخ سے مربوط تھے۔ اپنے ان خطوط کے علاوہ جو انھوں نے ناسخ کو لکھے ہیں اور جن میں اغراض کے شائبے بھی بکثرت موجود ہوں گے انھوں نے

دوسروں سے بھی زبانی یا تحریری طور پر ناسخ کا ذکر اور ان کے کلام پر رائے دی ہے یہ سارا مواد فطرتاً زیادہ معتبر اور معروضی ہے۔

شیخ امیر اللہ سرور کو لکھتے ہیں :

"میں نے مرزا حیدر علی افصح کو فرد کامل پایا ان کی روش پسندیدہ اور طرز منتخب ہے اور یہی شیوہ مکرمی شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش اور دیگر تازہ خیالان لکھنؤ کا ہے۔" (کلیات نثر ۱۲۵)

حاتم علی مہر کو لکھتے ہیں :

"ناسخ مرحوم جو تمھارے استاد تھے میرے بھی دوست صادق الوداد تھے۔"

(خطوط غالب مہر ۴۴۵)

غالب نے ایک قصیدہ روشن الدولہ کی معرفت نصیر الدین حیدر کی خدمت میں بھیجا یہ قصیدہ بادشاہ کے سامنے پڑھا گیا سنانے والے میر ضمیر تھے پانچ ہزار روپیہ اس پر انعام ملا۔ یہاں لوگوں نے سازش کر کے پورا انعام خورد برد کر دیا غالب کو انعام ملنے کی خبر ملی اور نہ پہنچنے کا تعجب ہوا انھوں نے ناسخ کو لکھا کہ آپ مفصل کیفیت دریافت کر کے لکھیے انھوں نے لکھا کہ پانچ ہزار ملے تین ہزار روشن الدولہ کھا گئے اور دو ہزار منشی محمد حسن کو جو قصیدہ لائے تھے، دیے اور کہا جو مناسب ہو غالب کو بھیج دو۔ غالب نے لکھا مجھے کچھ نہیں ملا۔ ناسخ نے جواب میں پھر لکھا کہ اب آپ مجھے خط لکھیے جس کا مضمون یہ ہو کہ میں نے بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ بھیجا اور معلوم ہوا کہ وہ قصیدہ حضور میں گزرا مگر یہ نہیں معلوم ہوا کہ صلہ کیا مرحمت ہوا" میں کہ ناسخ ہوں اپنے نام کا خط بادشاہ کو پڑھوا کر ان کا کھایا ہوا روپیہ ان کے حلق سے نکال کر تم کو بھیج دوں گا۔" مگر غالب کی بدقسمتی کہ ادھر انھوں نے خط روانہ کیا ادھر خبر اڑی کہ نصیر الدین حیدر نے انتقال کیا۔

"اب کہو میں کیا کروں اور ناسخ کیا کرے"

(خط بنام تفتہ خطوط غالب، مہر ۱۹۰)

نصیر الدین حیدر ۸ جولائی 1837ء کو مرے یہ ساری خط و کتابت اسی زمانہ میں ہوئی ہوگی اس کے بعد غالب کی مطلب برآری کیا ہوتی روشن الدولہ معزول ہو گئے حکیم مہدی وزیر ہو گئے اور ناسخ جلاوطن ہو گئے۔ صفیر بلگرامی کی روایت کے مطابق (جلوۂ خضر ۱/ 234) غالب نے ناسخ کے لسانی اصلاحات کو سراہتے ہوئے ایک مختصر سا ریمارک کیا "ناسخ کے یہاں کمتر، آتش کے یہاں بیشتر یہ تیز نشتر ہیں"

اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب نے ناسخ کے فن کے متعلق جو اندازہ لگایا تھا وہ کس قدر صحیح اور حق بجانب تھا۔ غالب کے دیوان میں شاعروں کے مصرعہ پر تضمین کہیں شاذ و نادر ہی ملے گی مگر انھوں نے ناسخ کے مصرعہ پر تضمین کی ہے ؎

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

تاریخ ادب اردو میں ناسخ کے شاگردوں کی تعداد بھی مثالی کہی جا سکتی ہے۔ مصحفی، آتش اور ناسخ ان اساتذہ میں ہیں جن کے شاگردوں کی تعداد کا جواب ملنا مشکل ہے اگرچہ آزاد نے یہ لکھا ہے (آب حیات 398) کہ آتش نے جتنے شاگرد پائے کسی استاد کو نصیب نہیں ہوے۔ اس سلسلہ میں کوئی معروضی جائزہ تو نہیں لیا گیا ہے مگر خیال ہوتا ہے کہ مصحفی کے شاگردوں کی تعداد آتش کے شاگردوں سے زیادہ رہی ہوگی اور ناسخ کے شاگردوں کی تعداد غالباً ان دونوں سے زیادہ ہوگی 1824ء تک کہ جب مصحفی زندہ تھے۔ فطرتاً آتش کے شاگردوں کی تعداد کم رہی ہوگی ناسخ کے شاگرد اس سے بہت پہلے سے نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ پھر ناسخ نے بیرون لکھنؤ بھی بہت شاگرد بنائے۔ ناسخ کے کتنے شاگرد تھے اس کا پتہ تو شاید کبھی نہ چل سکے جن لوگوں کو کسی تاریخ تذکرہ وغیرہ میں جگہ مل گئی ابھی ان سب کے نام بھی سامنے نہیں آئے ہیں نہ معلوم کتنی صورتیں ہوں گی کہ خاک میں پنہاں ہو گئیں اور اب ان کا کوئی سراغ بھی نہیں مل سکتا اگر تھوڑی سی جستجو

ہو تو بغیر خاص تکلیف اٹھائے ہوئے ان کے سوے زیادہ شاگردوں کی نشاندہی ہوسکتی ہے یہ جستجو اور تحقیق ایک مستقل کام ہے یہاں تو ان کی دستیاب فہرست دینا بھی ممکن نہیں ہے صرف زیادہ نمایاں اور خود مرتبہ استادی پر پہنچنے والے چند شاگردوں کے نام درج کیے جاتے ہیں ان میں میر علی اوسط رشک، شیخ امداد علی بحر، محمد مرزا انس، مہدی حسین آباد، مرزا مہدی قبول، فقیر محمد خاں گویا، آغا حسن امانت، مرزا حاتم علی مہر، کلب حسین خاں نادر، خواجہ وزیر، مرزا جعفر علی فصیح، دلگیر محمد رضا برق، اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی۔ وغیرہ شامل ہیں۔

مجموعی طور پر ناسخ کے شاگرد اسی سانچے میں ڈھلی شاعری کرتے رہے جو ناسخ نے وضع کر دیا تھا ان میں سے زیادہ تر ایسے تھے کہ جو اپنے استاد کا چربہ نظر آتے ہیں ان میں سے کچھ ایسے تھے جیسے رشک اور نادر جنھوں نے اصلاحات ناسخ کو قانون کا درجہ دینے کی کوشش کی۔ اگرچہ ان کے انتقال کے بعد ان کے شاگردوں کا شیرازہ کسی حد تک منتشر بھی ہوا جس کا زیادہ تر سبب اپنی انفرادیت کا استحکام تھا مگر ان کے شاگرد عام طور سے انفرادیت کی تلاش میں ناکام رہے ہاں ان کی کوشش سے ایک اسکول وجود میں آگیا جسے ناسخ اسکول کہا جاتا ہے۔ اکثر شاگرد ان کی وفات کے بعد بہت ملول و غمزدہ رہے اس لیے کہ ان کی ادبی پناہ گاہ باقی نہ رہی تھی یہ بھی ناسخ کے اثر و رسوخ کی علامت ہے۔

برق کہتے تھے:

"مجھ نالائق نے بادشاہ کی صحبت (واجد علی شاہ) اختیار کر کے اپنے فن کو ذلیل کیا مجھ کو تو چاہیے تھا کہ شیخ صاحب کی قبر پر بیٹھ رہتا۔"

(اردوئے معلیٰ ۱۹۱۳)

چند شاگردوں نے نظم میں بھی اسی طرح کے جذبات اور ناسخ سے پہنچنے والے فیض کا ذکر کیا ہے۔

ہو متانت شعر میں اپنے نہ کیونکر اے سحر
مدتوں صحبت اٹھائی ناسخ مغفور کی
(امان علی سحر)

اے مسیحا کیوں نہ ہو بے رنگ بستان سخن
حیف دنیا سے جناب ناسخ اشعر اٹھا
(محمد علی مسیحا)

بس ہے تقلید کو اے رشک کلام ناسخ
قول استاد بھی استاد ہے استاد کے بعد
(علی اوسط رشک)

باب دوم

(۱)

ناسخ نے اپنے بعد اچھا خاصا ادبی ورثہ چھوڑا ہے۔ کلیات اشعار جو مطبوعہ شکل میں دو بڑے اور ایک مختصر دیوان اور ایک مثنوی پر مشتمل ہے اس کے علاوہ کلیات میں فردیات، رباعیات، مدحیہ قطعات اور تاریخی قطعات کا بھی قابل توجہ ذخیرہ شامل ہے۔ ایک طولانی مثنوی سراج نظم کے نام سے علیحدہ چھپی ہوئی دستیاب ہے ان مثنویوں کے علاوہ تین مثنویاں اور بھی ایسی ہیں جن کی نسبت ناسخ کی طرف دی گئی ہے۔ مثنوی معراج، مثنوی شہادت نامہ آل نبی اور مثنوی مولد رسول مختار۔ ان منظومات کے علاوہ ایک رسالہ قافیہ بھی ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

کلیات اشعار بار بار چھپ چکا ہے۔ مختلف دواوین کے مخطوطے بھی جن میں سے بعض بڑی اہمیت کے حامل ہیں ہندستان اور پاکستان کے مختلف کتب خانوں میں فراوانی کے ساتھ ملتے ہیں نجی ملکیت میں بھی بکثرت مخطوطے موجود ہیں۔ قیاس یہ ہے کہ شاید اردو شعراء میں سے کسی کے بھی مخطوطے اتنی کثرت کے ساتھ دستیاب نہیں ہیں۔ اس کا سبب یہ بھی تھا کہ وہ خود اپنے کلام کی نقلیں بکثرت تیار کرایا کرتے اور دوستوں اور قدر دانوں کو تحفۃً دیتے تھے۔ بہت سے قدر دان خود بھی نقلیں حاصل کر لیتے تھے اس کے علاوہ دوسرے شہروں میں اور اطراف وجوانب کے صاحبان ذوق کے لیے دیوان ناسخ ایک گراں قدر تحفہ سمجھا جاتا تھا

اورصاحبان فہم اسے حاصل کر کے شاعری کے نئے رنگ و مذاق سے اپنے کو آشنا کرتے تھے اور زبان اردو کے منظوم دستورالعمل کے طور پر اسے پڑھتے تھے اور استفادہ کرتے تھے ان کا دیوان محض اشعار کا مجموعہ نہیں بلکہ نصاب کی ایک کتاب بھی سمجھا جاتا تھا۔

ان کے کلیات کی پہلی اشاعت ان کے انتقال کے بعد 1842ء میں ہوئی لکھنؤ کے مطبع محمدی میں کہ جس کے مالک میر حسن رضوی تھے' اشاعت اول کا سارا اہتمام اور دیکھ بھال ان کے عزیز شاگرد رشک نے کی۔

کلیات میں تین دیوان موجود ہیں اگرچہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو ہی دیوان ہوں ان کے پہلے دیوان کا نام 'دیوان ناسخ' ہے جو تاریخی نام ہے اور اس کے برآور د کرنے والے اور اس طرح نام بھی رکھنے والے ناسخ کے شاگرد میاں غنی ہیں یہ دیوان 1232ھ 16-1816ء میں مرتب ہوا۔ ان کے دوسرے دیوان کا نام 'دفتر پریشان' ہے جو خود ناسخ کا رکھا ہوا ہے اور اس کا خاصا بڑا حصہ ان غزلیات پر مشتمل ہے جو عہد جلاوطنی اور مسافرت میں سرانجام ہوئی تھیں یہ دیوان 32-1831ء / 1247ھ میں مرتب ہوا یعنی قبل اس کے کہ وہ اپنی جلاوطنی کے بعد لکھنؤ پہنچتے۔

ناسخ کے تیسرے دیوان کا نام 'دفتر شعر' ہے جو ان کے لائق شاگرد رشک کا رکھا ہوا ہے۔ یہ نام بھی تاریخی ہے اور اس سے ہجری حساب سے 1254 اور عیسوی حساب سے 39-1838ء حاصل ہوتے ہیں مگر اس کی تدوین 1838ء میں یقیناً ہو گئی تھی اس لیے کہ یہی سال ناسخ کی وفات کا ہے' یہ دیوان ناسخ کی حیات ہی میں مرتب ہو گیا تھا۔ حجم میں یہ دیوان مختصر بھی ہے ناسخ کے اس دیوان کے علیحدہ مخطوطے بھی دستیاب ہیں مگر چند ہی۔ ناسخ کا دیوان سیوم عرصہ تک تحقیقی غلط فہمیوں کا شکار رہا اور یہ خیال کیا جاتا رہا کہ ناسخ نے صرف دو ہی دیوان چھوڑے ہیں لیکن ساری غلط فہمیاں کلیات کی اشاعت اول کے خاتمہ سے دور ہو جاتی ہیں اس کے اندراجات سے علم ہوتا ہے کہ اشاعت کے وقت شاید دیوان سیوم کے اختصار کے پیش نظر رشک نے اس کو

ردیف وار دیوان دوم میں ملا کر چھپوا دیا اور اس طرح بظاہر تین کے بجائے دو ہی دیوان رہ گئے۔ رشک کی یہ کارروائی مشکل ہی سے درست ٹھہرائی جا سکتی ہے اگر دیوان سیوم کا مخطوطہ الگ سے دستیاب نہ ہوتا تو آج یہ سراغ لگانا ممکن ہی نہ ہوتا کہ ناسخ کے دیوان دوم کی ہر ردیف میں کہاں دیوان دوم ختم ہوتا ہے اور کہاں سے دیوان سیوم شروع ہوتا ہے۔ اس اندرونی ثبوت کے بعد اگرچہ کوئی شبہ دیوان سیوم کے وجود میں نہیں رہ جاتا مگر اس بات کے ثبوتِ مزید کے طور پر کہ ناسخ کا تیسرا دیوان ان کی زندگی ہی میں مرتب ہو گیا تھا اور رشک اس کا تاریخی نام رکھنے والے تھے، بعد میں اس کو مرتب کرنے والے نہ تھے جس ذیل شعر کافی ہے کہ جو مطبوعہ کلیات میں بھی موجود ہے اور دیوان سیوم کے مخطوطہ میں بھی جس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ تیسرے دیوان کا جزو ہے ؎

پھر کسی محبوب معنی فہم سے الفت ہوئی
پھر نیا دیوان ناسخ کا مرتب ہو گیا

کلیات کا پہلا اڈیشن جو رشک کی نگرانی میں چھپا تھا اور اس کی صحت کا اہتمام بھی بہت کیا گیا تھا ہر چند کہ بعد میں شایع ہونے والے ہر اڈیشن سے بہتر ہے پھر بھی اغلاط کتابت سے خالی نہیں رشک کو سات صفحے کا غلط نامہ اس کے ساتھ لگانا پڑا۔ اس بات کا بھی شبہ ہے کہ رشک نے دیوان چھپوانے میں کہیں کہیں الفاظ کے ردوبدل سے بھی کام لیا ہے بہت ممکن ہے کہ رشک کے پیش نظر کوئی ایسا مخطوطہ ہو جو خود ناسخ کا دیکھا ہوا اور صحت کردہ ہو یعنی اس آخری ردوبدل اور نظر ثانی پر مشتمل ہو جس سے لوگ بالعموم واقف نہ تھے۔ رشک کے اس غلط نامہ کے بعد بھی کلیات میں کچھ نہ کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں جن کا ذکر غلط نامہ میں نہیں ہے۔ کلیات جن اصناف شاعری پر مشتمل ہے ان کا مختصر تعارف و تفصیل درج ذیل ہے۔

قصیدہ نگاری

ناسخ کی لیاقت اور ان کا دور قصیدہ نگاری کے لیے نہایت موزوں تھا ان کے عہد میں مصحفی، انشا، شاہ نصیر شہیدی، غافل گویا، ذکی مراد آبادی اور ذوق و غالب نے پرشکوہ اور بلند پایہ قصائد کے انبار

لگا دیے تھے اس ماحول میں حیرت کا مقام ہے کہ ناسخ اور ان کے حریف آتش قصیدہ گوئی میں کوئی نام نہ نکال سکے۔ آتش تو خیر صوفی مزاج اور دنیا کے جھگڑوں سے اپنے کو علیٰحدہ رکھتے تھے مگر ناسخ دنیاداری کے فن سے واقف تھے اور ان کے سب ہی تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ طبیعت قصیدوں سے بہت مناسب تھی بلکہ ان کی غزلوں پر بھی عام اعتراض یہی ہے کہ وہ قصیدہ نما ہیں مگر ان کے کلیات میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں ہے جس کو روایتی اصطلاح کے مطابق قصیدہ کہا جاسکے۔ ائمہ کرام کی شان میں جو کچھ ملتا ہے وہ قصیدہ نہیں بلکہ مدحیہ نظم کی حیثیت رکھتا ہے۔ امرار کی شان میں بھی مدحیہ قطعات بہت ہیں مگر ان پر قصیدہ کا اطلاق نہیں ہوتا آغا میر کے لیے 63 اشعار پر مشتمل صنعت توشیح میں ان کے اشعار قصیدہ کی کلاسیکی تعریف میں نہیں آتے ہیں شاید ان کی طبیعت کا استغنا اور خودداری کا مادّہ جو اُن میں بہت تھا قصیدہ نگاری سے مانع ہوا پھر بھی بزرگانِ دین کی شان میں اپنی حیثیت کے مطابق قصیدہ کہنے میں انھیں کیا تکلف ہو سکتا تھا مگر لکھنؤ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں منیر شکوہ آبادی کی ایک تصنیف 'سنان دلخراش' کا مخطوطہ موجود ہے۔ جس کے حواشی میں یہ بات درج ہے کہ ناسخ جب الہ آباد پہنچے تو ان کے پاس قصائد کا بھی ایک مجموعہ تھا جس میں 98 قصیدے موجود تھے اور مختلف پرچوں پر بد خط لکھے ہوئے ایک جزودان میں رکھے رہتے تھے ان قصائد میں کچھ امرار کی ہجویں بھی تھیں جنھیں ناسخ کے ایک جعل شاگرد نے جو اسی مقصد سے ان کے پاس پہنچا تھا چرا کر ان اشخاص تک پہنچا دیا جن کا ان قصیدوں میں ذکر تھا۔ اس کے بعد معلوم نہیں ہوا کہ یہ قصیدے کہاں گئے اور ان کا کیا حشر ہوا۔

تاریخ گوئی

قدیم زبانوں اور قدیم زمانہ میں بھی اہم واقعات اور سوانح کی تاریخ نکالنے کا دستور تھا اردو میں بھی عربی کے اثر سے کم اور فارسی کے اثر سے زیادہ تاریخ گوئی کا رواج اردو شاعری کے رواج کے ساتھ ساتھ نظر آتا ہے۔

چونکہ ہر حرف کا ایک خاص عدد مقرر ہے اس لیے ایسے الفاظ منتخب کیے جاتے ہیں جن کے اعداد حروف کا مجموعہ اس سال کے مطابق ہو کہ جس میں وہ واقعہ ظہور پذیر ہوا کہ جس کی تاریخ کہنا مطلوب ہے نظم میں یہ اہتمام اور مشکل ہو جاتا ہے اور ایسی تاریخ نکالنا جو معنوی خوبی اور عددی مطابقت رکھتی ہو شاعری کا کمال سمجھا جاتا ہے ادبی قدر و قیمت کے علاوہ بھی تاریخ نگاری (Chronogram) کی اہمیت اور فائدہ سے انکار ممکن نہیں ہے عہد وسطی سے لے کر انیسویں صدی کے آخر تک خود تاریخ کو مرتب کرنے میں تاریخ گو شعراء کے مہیا کیے ہوئے مواد سے بہت کام لیا گیا ہے ہندوستانی تاریخ اور بعض اہم افراد کے مرنے اور پیدائش کی اطلاع کا کبھی کبھی واحد ذریعہ وہ تاریخ بن جاتی ہے جسے کوئی شاعر نظم کر جاتا ہے۔ اردو میں رفتہ رفتہ اس فن نے صنایع کی ایک قسم کے طور پر مستقل اہمیت پیدا کر لی بالخصوص انیسویں صدی میں یہ شوق اپنے کمال پر پہنچ گیا تھا اور پھر تاریخ نگاری میں مزید ایسی صنعتوں کا استعمال بھی رائج ہو گیا کہ جن سے اصل مقصد کو تو کچھ زیادہ فائدہ نہیں ہوا مگر شاعروں کی ریاضت، جان سوزی اور جان فشانی، لیاقت اور قابلیت کا اندازہ ضرور ہوتا ہے

ناسخ ایک ریاضت پسند شاعر تھے اور اس لیے تاریخ گوئی کی طرف فطری میلان رکھتے تھے انھوں نے تقریباً آغاز شاعری سے تاریخ گوئی کا بھی آغاز کر دیا تھا اور زندگی کے آخری عہد تک اس مشغلہ کو جاری رکھا ان کے کلیات میں بکثرت تاریخیں موجود ہیں جن میں سے کچھ بہت ندرت کی حامل ہیں۔ یہ تاریخیں اہم واقعات سے بھی متعلق ہیں اور معمولی واردات سے بھی۔ اور بہت سی باتوں کے علاوہ خود ناسخ کے سوانح حیات کے سلسلہ میں ان تاریخوں کی اہمیت ہے۔ ناسخ کی زندگی کے بہت سے واقعات اور ان کا سنہ وقوع ناسخ کی کہی ہوئی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے خود اس مقالہ میں بہت سے معلومات انھیں تاریخوں کی مدد سے درج ہوئے ہیں۔ یہ پتہ ہی نہ چلتا کہ ناسخ نے کتنی

عمرِ پائی اگر ان کی وفات پر رشک کا کہا ہوا حسب ذیل قطعہ دستیاب نہ ہوتا ؎

وا دریغا کر د رحلت ناسخ معجز بیان　　انتقالش داد عالم را غم جان کاہ وائے
یک ہزار و دو صد و پنجاہ و چا سال بود　　از محرم بود ماہ پنجمیں، آں ماہ وائے
رشک روزِ مرگ و تاریخ و سنین و ماہ گفت　　بود پنجم بست و چارم پنجشنبہ آہ وائے

ناسخ استادِ رشک حسرت عمر　　عمر دادے ہے بہ سال شصت و نہم
رشک تاریخ انتقالش نوشت　　مُردادے ہے بہ سال شصت و نہم

ان تاریخوں سے نہ صرف ان کی تاریخ پیدائش کا اندازہ لگانا ممکن ہوا بلکہ مرنے کا دن مہینہ، تاریخ اور سال سب کا علم ہوتا ہے۔

ناسخ نے اس فن کے نہ صرف اچھے نمونے چھوڑے ہیں بلکہ اِس ذوق کی ترویج میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے ان کے شاگردوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو تاریخ گوئی کا ذوق نہ رکھتا ہو رشک تو تاریخ گوئی کی کثرت میں بھی اپنے استاد کے مثل تھے۔

ناسخ اور ان کے حلقہ کے اثرات کی وجہ سے تاریخ گوئی کا ذوق جس طرح عام ہوا تھا اس کا تذکرہ نظم طباطبائی نے اپنے ایک مضمون میں جو مالک الدولہ صولت سے متعلق ہے کیا ہے، جس میں وہ نہ صرف صولت کی تاریخ گوئی کے شوق کا ذکر کرتے ہیں بلکہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ جب وہ خود 1872ء میں لکھنؤ آئے تو دیکھا کہ یہاں کے مشاعروں میں (ناسخ کے اثر سے) یہ رواج عام ہو گیا تھا کہ غزل کا مقطع تاریخی ہوا کرتا تھا۔

(رسالہ ادیب مئی 1913ء)

نظم طباطبائی ہی کا بیان ہے کہ آتش نے کبھی تاریخ نہیں کہی ناسخ کی کہی ہوئی تاریخوں کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے یہاں نمونہ دینے کی کوئی خاص ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ تفصیل کے لیے ان کے کلیات کی طرف رجوع ہو سکتی ہے فقط ایک نمونہ پر اکتفا کی جاتی ہے ؎

شد ز جہاں میر محمد تقی — داغ زبے مہری اہل جہاں — ۱۲۲۵ھ
ناسخ تاریخ وفاتش نوشت — داد ویلا مردشہ شاعراں — ۱۸۱۰ء

رباعیات

بظاہر ناسخ نے فن رباعی کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی ان کی رباعیاں نہ تو تعداد کے اعتبار سے بہت ہیں اور نہ معنویت کے اعتبار سے ایسی اثر انگیز ہیں کہ جن کو فارسی کے رباعی گو شعراء کے مقابلہ میں رکھنا تو در کنار اردو کے اچھے رباعی نگاروں کے مقابلہ میں لانا بھی بے جا ہوگا۔ ان کے کلیات میں ساٹھ پینسٹھ سے زیادہ رباعیاں نہیں ہیں ان کے مخطوطوں میں چند ایسی رباعیاں ضرور موجود ہیں کہ جو اب تک چھپی نہیں ہیں۔

اصناف شاعری میں فن رباعی کو بہت مشکل سمجھا جاتا ہے اس میں لفظ و معنی کی بندش اور اس کی وزن و عروض متعلق باریکیوں پر حاوی ہونا نہ صرف لیاقت چاہتا ہے بلکہ اچھی ریاضت و مشق کا بھی متقاضی ہے۔ وہ قطعہ کی طرح سہل فن نہیں ہے بہت سے غزل گو شعرا نے اچھی شاعری کرنے کے باوجود رباعی کے میدان میں یا تو قدم ہی نہیں رکھا یا بہت کم اس وادی کی طرف آئے چنانچہ صرف ناسخ ہی نہیں بلکہ عام طور سے اردو کے غزل گو شاعروں میں رباعی کی طرف کوئی کارساز رجحان نہیں ملتا ہے۔ دراصل راز یہ ہے کہ ان کے لیے زیادہ تر جو کچھ رباعی میں کہنا ممکن تھا اسے وہ غزل میں صرف کر دیتے تھے اور شاید ان کے لیے یہ بات گوارا نہ تھی کہ وہ غزل کا پیٹ کاٹ کے رباعی کی پرورش کریں اس لیے غزل گو شاعر کی رباعی نگاری یک گونہ غزل گوئی کی کترن سے انجام پاتی تھی۔ ناسخ کی رباعیاں بھی ان کی غزلوں کی چھیج سے وجود میں آئی ہیں اور اس لیے ان کی فنکارانہ مہارت کو دیکھتے ہوئے دوسرے درجہ کی کہی جا سکتی ہیں۔ ان رباعیوں میں ناسخ کے عام رنگ سے علیحدہ یہ بات ضرور ہے کہ ان میں صنعت گری اور لفظی کا ٹھاٹ عام طور سے نہیں ملتا ہے۔ زیادہ تر سہل اور رواں زبان میں نظم ہوئی ہیں مگر موضوع کے اعتبار سے ان رباعیوں میں کوئی خاص دل کشی نہیں ہے ان میں بہت سی

رباعیاں ان کے عہد جلاوطنی کی یادگار ہیں اور دوران سفر میں پہنچنے والے آزار و مصیبت کے بیان پر مشتمل ہیں مگر زیادہ تر ایسی ہیں کہ تاثیر و ندرت سے خالی ہیں مگر زبان پر قدرت اور نظم کے ماہرانہ سلیقہ کا اچھا نمونہ ہیں۔ نمونہ کے طور پر یہاں ان کی دو رباعیاں درج کی جاتی ہیں جن میں ندرت موجود ہے۔

لے کر جو گیا نامہ ہمارا قاصد — کیا ذکرِ جواب خود نہ آیا قاصد
مدت ہوئی انتظار کرتے کرتے — تھا عمر گذشتہ شاید اپنا قاصد

سیلاب رواں ہے چشم تر سے ہر دم — سوتے نہیں اک آن شب ہجر میں ہم
کس طرح پلک سے پلک لگ جائے کبھی — ملتے نہیں دریا کے کنارے باہم

ان رباعیوں میں خوش گوار مضمون آفرینی موجود ہے مگر یہ صورت حال بہت کم رباعیوں میں نظر آتی ہے۔ اسباب چاہے کچھ ہوں چند اچھی رباعیوں کی بنا پر ناسخ کو اس صنف میں کوئی بڑا مرتبہ دینا ممکن نہیں ہے یہ رباعیاں خیال کی وہ معمولی لہریں ہیں جو تغیر پذیر زندگی کی عام رفتار اور اس کے ردعمل سے پیدا ہوگئی ہیں۔ نہ ان میں کوئی فلسفہ ہے نہ متاثر کرنے والا جذبہ اور نہ چکا چوند کر دینے والی صنعتی نیرنگی۔

ان کے قطعات کا ذکر بار بار آچکا ہے اور ان کے لیے کسی خصوصی عنوان کے قایم کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی ہے۔ ان کی رباعیوں کے متعلق جو باتیں کہی گئی ہیں وہی زیادہ تر ان کے قطعات پر بھی صادق آتی ہیں ان کے قطعات سے جو زیادہ تر مدحیہ ہیں ان کے سماجی روابط اور مختلف امرار کے درباروں اور اعیان و اشراف کے درمیان ان کے نفوذ و رسوخ کا پتہ ضرور چلتا ہے۔

مثنویات

ناسخ کی طرف کل پانچ مثنویوں کی نسبت دی جاتی ہے ان میں سے مثنوی 'مولد شریف رسول مختارؐ' کا ذکر مشہور تذکرہ نگار محسن علی نے اپنے تذکرہ سراپا سخن' میں کیا ہے۔ مگر نہ تو محسن علی کے علاوہ کوئی اور شخص اس کے وجود کی خبر دیتا ہے اور نہ اس کے وجود کا کہیں علم ہے۔ ممکن ہے انیسویں صدی میں یہ مثنوی موجود رہی ہو اور بعد میں اس طرح ضایع ہوگئی ہو کہ کسی کو سراغ بھی نہ لگ سکا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ محسن علی کو خود سہو ہوا ہو۔

ناسخ کی 'مثنویِ معراج' کا بھی تقریباً یہی عالم ہے اس کے ناقص مخطوطے کی خبر (رسالہ اردو کراچی ۱۹۵۸ء مضمون از رشید حسن خاں) کچھ عرصہ پہلے دستیاب ہوئی تھی، موضوع نام سے ظاہر ہے، جو مخطوطہ نظر میں آیا ہے وہ ناقص ہے۔ دستیاب شدہ اوراق کے مطابق اشعار کی تعداد 395 ہے ترقیمہ سے پتہ چلتا ہے کہ اسے ۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ء یعنی ناسخ کی وفات کے کئی سال بعد تیار کیا گیا تھا اگر یہ مثنوی جیسا کہ ترقیمہ میں نسبت دی گئی ہے واقعاً ناسخ کی ہے تو ان کے ابتدائی عہد کی یادگار ہوگی جبکہ انھوں نے مذہب شیعہ نہیں اختیار کیا تھا اس لیے کہ مثنوی کے اندر شیعی عقائد کے خلاف باتیں ملتی ہیں اور شاید یہی وجہ ہو کہ ناسخ نے اس مثنوی کو نظر انداز کر دیا ہو اور ان کا قریبی حلقہ بھی اس سے واقف نہ ہو سکا ہو۔

ان کی تیسری مثنوی 'شہادت نامہ آل نبی' ہے۔ اس نام کی ایک مثنوی مطبع نولکشور سے متعدد بار چھپی ہے اس کا تیسرا اڈیشن اپریل ۱۸۸۸ء میں شایع ہوا۔ اس مثنوی کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے یہ واقعات کربلا سے متعلق ہے اس مثنوی کے دو ایک مخطوطے بھی علم میں آئے ہیں اس کے وجود کی نشاندہی محسن علی تذکرہ سراپا سخن میں کرتے ہیں اس کو دیکھنے کا دعویٰ صفیر بگرامی بھی (جلوہ خضر 2/32) کرتے ہیں مطبوعہ نسخہ میں نولکشور پریس کے کارپردازوں نے اس کی نسبت ناسخ کی طرف دی ہے۔ مثنوی

معیاری نہیں ہے زبان و بیان کے ایسے اسقام موجود ہیں جن کا ناسخ سے سرزد ہونا ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ شاید یہ مثنوی بھی اگر ناسخ ہی کی کہی ہوئی ہو، تو ان کے ابتدائی عہد سے تعلق رکھتی ہوگی اور بعد میں مثنوی معراج کی طرح اور انھیں اسباب کی بنا پر نظرانداز ہوگئی ہو۔ یہ بھی امکان ہے کہ مثنوی کسی غیر معروف شاعر کی ہو جس کا نام امام بخش ہو اور لوگوں نے اور مطبع والوں نے بھی اس کو نام کے اشتراک کی وجہ سے ناسخ کی طرف منسوب کر دیا ہو۔

ان تینوں مثنویوں کے بعد جو غیر معیاری بھی ہیں اور مشکوک نسبت بھی رکھتی ہیں ناسخ کی صرف دو مثنویاں ایسی رہ جاتی ہیں جو یقیناً انھی کی ہیں اور معیار کے اعتبار سے بھی بہتر ہیں اور دونوں ہی مطبوعہ ہیں ایک تو کلیات کے ساتھ ہی چھپی ہے اور دوسری رشک کے اہتمام سے ظہور میں آئی ہے۔

مثنوی اس مثنوی کا حقیقۃً کوئی نام یا عنوان نہیں ہے کلیات کی اشاعتِ اول میں دیوان دوم کے بعد ضمیمہ کے طور پر حاشیہ میں چھپی ہے بعد میں ناسخ کے کلیات کا جو اڈیشن 1863ء میں چھپا اس میں بھی یہ مثنوی موجود ہے پھر بعد میں جو اڈیشن نولکشور کے چھاپہ خانہ سے چھپے ان میں سے یہ مثنوی حذف کر دی گئی۔ اس مثنوی کا ایک علیحدہ اڈیشن 'مثنوی ناسخ' کے نام سے 1931ء میں حبیب اللہ خاں غضنفر نے الہ آباد سے شایع کیا۔ اس مثنوی کے مخطوطے بھی دستیاب ہیں ایک مخطوطہ رضا لائبریری رام پور میں اور ایک نہایت خوشخط لکھا ہوا مخطوطہ لکھنؤ یونیورسٹی کی لائبریری میں کلیات کے اس نسخہ میں موجود ہے جسے "نسخہ جان پالمر" کہا جاتا ہے۔

اس مثنوی کا موضوع حضرت علیؑ کی ولادت اور اس سے متعلق مختلف واقعات اور معجزات کا تذکرہ ہے۔ اشعار کی تعداد تقریباً 750 ہے۔ اس مثنوی کا معیار بھی قدرے بہتر ہے لیکن اس میں زبان اور بیان کی وہ صفائی جس کے لیے ناسخ شہرت رکھتے ہیں اور ان متروکات

کا وجود جوان کے آخری عہد کے کلام میں نہیں ملتے ہیں۔ اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ یہ مثنوی بالکل ابتدائی کلام تو نہیں ہے ہاں ان کے دیوان اوّل کی معاصر ضرور ہوسکتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ نے اس مثنوی پر توجہ یا نظر ثانی نہیں کی اور ان کی وفات کے بعد رشک نے اپنی یا ان کے شاگردوں کی رائے سے شایع کردی شاید ناسخ زندہ ہوتے تو نظر ثانی کے بعد ہی شایع کرنے کی اجازت دیتے۔ ناسخ کی طرف جتنی مثنویاں منسوب ہیں اور جن کا ذکر کیا جاچکا ہے معیار کے مطابق بہر حال نہیں ہیں شاید یہی خیال ان کے ذہن میں کھٹکتا ہو اور انھیں یہ خواہش پیدا ہوئی ہو کہ وہ ایک ایسی مفصل، جامع اور اعلیٰ پایہ کی مثنوی نظم کریں جو ان کے شایان شان ہو اور بحیثیت مثنوی نگار کے ان کے لیے نام آوری کا سبب ہو۔ اسی خیال نے یا شاید کسی بزرگ کی فرمائش نے ان میں آخر عمر میں ایک مثنوی کہنے کا جذبہ پیدا کیا اور اسی کے نتیجہ میں ان کی آخری مثنوی 'سراج نظم' وجود میں آئی۔

سراج نظم

یہ مثنوی 1838ء میں مکمل ہوئی یہی سال ناسخ کی وفات کا بھی ہے اور پہلی مرتبہ 1265ھ / 1848ء میں چھپی۔ اشاعت کا سارا اہتمام رشک نے کیا انھوں ہی نے اس مثنوی کا نام بھی رکھا تھا' نام ناسخ کی زندگی میں رکھا گیا۔ نام سے سنہ تصنیف 1838ء / 1254ھ برآمد ہوتا ہے مطبوعہ مثنوی تقریبًا ۹۱ صفحات پر مشتمل ہے اشعار کی کل تعداد تقریبًا 3695 ہے پوری مثنوی مختلف ذیلی عنوانات میں تقسیم ہے جن کی کل تعداد 163 ہے اور اصل عنوانات چار مجلسوں میں بٹے ہوئے ہیں۔

مثنوی کا موضوع حدیثِ مفضّل ہے۔ مفضّل امام جعفر صادقؑ کے اصحاب مقربین میں سے تھے اور ان کی حدیثوں کے مشہور اور معتبر راوی مانے جاتے ہیں۔ اصل حدیث عربی زبان میں ہے اس کا فارسی ترجمہ علامہ مجلسی (وفات 1698ء / ۱۱۱۰ھ) کی طرف منسوب ہے ناسخ کی عربی استعداد چونکہ محدود تھی اس لیے یقین ہے کہ انھوں نے نظم کی اصل بنیاد

فارسی ترجمہ پر رکھی ہوگی اپنی مثنوی کو وہ اصل میں ترجمہ کہتے ہیں مگر حقیقتاً وہ ترجمہ نہیں ہے بلکہ زیادہ تر انھوں نے حدیث کے محصّل کا ترجمہ کیا ہے اس حدیث کا عربی متن بحارالانوار کی پہلی جلد میں موجود ہے۔ بحارالانوار بھی علامہ مجلسی کی تالیف ہے۔ حدیث مفضّل ایک طولانی حدیث ہے اس لیے ایک نشست کے بجائے چار نشستوں میں مفضّل نے اس کو سنا۔ اس حدیث کا اصل موضوع ان ملاحدہ کا جواب دینا تھا جو امام جعفر صادقؑ کے زمانہ میں بکثرت پیدا ہو گئے تھے اور خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے خلقت آسمان و زمین، انسان اور اس کے مختلف تخلیقی حالات، عالم طبیعی، نجوم و حیوانات و نباتات کی خلقت کے رموز اور ان کے فوائد کی تفصیل بنا کر ضرورت صانع کو واضح کرنا تھا بالخصوص انسان کے اعضا و جوارح ان کے کام اور مقاصد میں مناسبتوں کا ذکر کر کے ایک خالق مدبّر کا ثبوت فراہم کرنا تھا اسی لیے اس حدیث کا نام توحید مفضّل بھی ہے۔ اس حدیث میں کہیں کہیں توضیحی نوٹ علامہ مجلسی کا بھی شامل ہے۔ ناسخ نے ترجمہ میں بہت احتیاط سے کام لیا ہے اور ہر ہر جزو کی الگ الگ واضح نشاندہی کی ہے۔

رشک نے اس مثنوی کے ساتھ ایک مفید مفصّل اور اطلاعاتی منظوم خاتمہ شامل کیا ہے جس سے مثنوی کے متعلق بہت سی باتوں کا علم ہوتا ہے۔ رشک کا بیان یہ ہے کہ ناسخ نے مثنوی مکمل کی تو محمد علی شاہ 42-1837ء کو نذر کی اس امر کی تصدیق خود مثنوی میں درج اشعار سے نہیں ہوتی لیکن بات قرین قیاس ہے ممکن ہے ناسخ نے مزید تقرّب حاصل کرنے کے لیے بادشاہ کو جو اُن پر مہربان تھے یہ مثنوی نذر کی ہو لیکن اگر نذر کرنے کے ارادہ سے مثنوی کہی ہوتی تو قاعدہ اور دستور کے مطابق ان کی تعریف و توصیف میں کچھ اشعار ضرور موجود ہوتے حالانکہ ان کی مدح میں ناسخ کے متعدد قطعات ان کے کلیات میں موجود ہیں۔ دراصل مثنوی میں موجود اشعار یعنی اندرونی شہادت کی بنیاد پر اس کے وجود میں آنے کا سبب ، قبلہ دین و کعبہ ایمان۔ صاحب زہد بوذر سلمان، مرزا کاظم علی صالح ہیں اور یہ وہی مرزا کاظم علی ہو سکتے ہیں جن کا ذکر اس سے پہلے بھی آچکا ہے۔ وہ اپنے عہد کے نہایت ممتاز اور

مقدس علما میں محسوب ہوتے تھے ناسخ کے مذہبی رجحانات پر ان کی تربیت کی چھاپ واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ مثنوی ان کے ارشاد سے نظم ہوئی

ان کے ارشاد سے ہوئی ہوئی یہ نظم
ان کی امداد سے ہوئی یہ نظم

اس شعر سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ اس مثنوی کے سلسلہ میں صرف ان کا ارشاد ہی نہیں بلکہ ان کی امداد بھی شامل تھی یہ بات مثنوی کے سال آغاز کے متعلق راہ نمائی کرتی ہے مرزا کاظم علی کا انتقال 1833ء میں ہوا یعنی جلاوطنی کے بعد ناسخ کے لکھنؤ پہنچنے (1832ء) کے ایک سال اور چند ماہ کے بعد انھوں نے اگر فرمائش کی ہوگی تو اسی درمیان میں اور مثنوی کا آغاز، اگر مرزا کاظم علی کی امداد پر بھی نظر رکھی جائے تو، اسی دوران میں ہوا ہوگا۔ مواد کی فراہمی اور حدیث کے ترجمہ اور رموز کے سمجھنے میں ان کی مدد شامل رہی ہوگی۔ اس طرح اس مثنوی کا آغاز 33/1832ء میں ہوا ہوگا اور تکمیل 1838ء میں ہوئی۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ اس درمیان میں ناسخ مسلسل نظم کرتے رہے ہوں اس لیے کہ یہ مثنوی اتنی بڑی بھی نہیں ہے کہ ناسخ کے ایسے ماہر فن کو اس تکمیل میں اتنا عرصہ لگ جاتا۔

یہ مثنوی ناسخ کی وفات کے تقریباً ۱۱۔ ۱۰ سال بعد چھپی اس عرصہ میں اس کا مسودہ غالباً فراموشی کے عالم میں پڑا رہ گیا ہوگا ورنہ کلیات کی طباعت 1892ء کے بعد جلد ہی چھپ جاتا رشک نے جو اشعار خاتمہ کے طور پر کہے ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رشک کے پاس اس کا کوئی نسخہ خود موجود نہیں تھا۔ ایک صاحب مولوی شہید جو ناسخ کے شاگرد تھے اور میاں جری جو برق شاگردِ ناسخ کے شاگرد تھے رشک کے پاس اس مثنوی کا مسودہ لائے اور فرمائش کی کہ اگر تصحیح وغیرہ کی ذمہ داری رشک لیں تو اسے چھپوا دیا جائے رشک نے یہ بات قبول کی اپنے ہاتھ سے ایک مکمل نقل تیار کی اور ہر طرح کے انتظام میں کوئی

دقیقہ نہیں اٹھا رکھا اور بالآخر لکھنؤ میں حاجی حرمین محمد حسین کے چھاپہ خانہ میں جو اس عہد کا مشہور مطبع تھا چھپوایا انھوں نے کوشش تو بہت کی کہ

نہ رہے شائبہ معائب کا
نہ رہے سقم سہو کاتب کا

لیکن انھیں ایک غلط نامہ لگانا پڑا اور یہ غلط نامہ بھی مکمل نہیں ہے اس میں مزید اندراجات کی گنجائش یقیناً موجود ہے یہ علم نہیں کہ اس مثنوی کا کوئی مخطوطہ اب بھی کہیں موجود ہے یا نہیں۔ اسی طرح اس کے مکمل طور پر دوبارہ چھاپے جانے کی بھی کوئی اطلاع نہیں ہے۔

ناسخ کی تمام مثنویوں میں یہ مثنوی صرف حجم کے اعتبار سے نہیں بلکہ معیار کے اعتبار سے بھی فوقیت رکھتی ہے اس میں نظم اور اس کے ضروری در و بست پر قدرت کا اظہار ہوتا ہے مگر جس اسلوب کے لیے ناسخ شہرت رکھتے ہیں وہ اس مثنوی میں بھی موجود نہیں ہے یہ مثنوی نہ تو ناسخ کے ایسے استاد کی شان کے مطابق ہے اور نہ اردو زبان کی دوسری مشہور مثنویوں کے مقابلہ میں رکھی جا سکتی۔ واقعہ اور حقیقت یہی ہے لیکن اس سلسلہ میں جو عذر درمیان میں لائے جا سکتے ہیں وہ بھی وزن و حقیقت رکھتے ہیں یہ کوئی ایسی مثنوی نہیں ہے جس میں اور مثنویوں کی طرح تخلیقی عمل کو بندش کے بغیر کارفرمائی کا موقع مل سکتا، اس کی بنیاد تخیّل کی اس اُڑان پر نہیں رکھی جا سکتی تھی کہ جو ناسخ کے زیر نگیں تھا یہ ایک مقدس حدیث اور کلام امام کا ترجمہ، خلاصہ اور محصّل نظم کرنے کا مرحلہ تھا اور ہر قدم پر بندش اور سمت موجود و مقرر تھی۔ ناسخ کو انھیں حدود کے اندر کے رہنا تھا ورنہ وہ معنوی تحریف و تخریب کے مرتکب قرار دیے جاتے۔ مولانا محمد حسین آزاد (وفات ۱۹۱۰ء) نے جو بات اس مثنوی کے لیے کہی ہے وہ ان کی سب ہی مثنویوں پر صادق آتی ہے۔

"لوگوں کی رائے میں ان کے رتبہ عالی سے گری ہوئی ہے اور چونکہ پابندی

ترجمہ حدیث کی ہے اس لیے ان پر گرفت بے جا ہے۔"

(آب حیات بضمن ناسخ)

فارسی کلام

ناسخ اردو کے شاعر تھے مگر اچھے فارسی داں تھے نہ صرف وہ اس زمانہ کے رواج کے مطابق خط و کتابت بالعموم فارسی میں کرتے تھے بلکہ فارسی نظم پر بھی قدرت رکھتے تھے انھوں نے بطور شاگرد کے نہ سہی مگر اس زمانہ کے مشہور فارسی داں قتیل سے بھی فیض اٹھایا تھا مگر ان کو فارسی زبان میں ہمہ دانی اور امتیاز خاص کا کوئی دعویٰ نہیں تھا۔ ان کی کوئی فارسی غزل ابھی تک دستیاب نہیں ہوئی ہے جو کچھ ہے وہ مدحیہ قطعات پر مشتمل ہے اور ان کے کلیات میں موجود ہے مخطوطوں سے کچھ غیر مطبوعہ فارسی کلام بھی حاصل ہو سکتا ہے متفرق مآخذ میں اور سرسری جائزہ کے مطابق ان کے تقریباً ۱۰۰۰ فارسی کے شعر دستیاب ہیں تقریباً 575 فارسی اشعار تو ان کے مطبوعہ کلیات میں موجود ہیں۔ ان کا فارسی کلام بہر حال اتنا ضرور موجود ہے کہ علی حسن خاں نے اپنے تذکرہ "صبح گلشن" میں جو فارسی شعراء کے لیے مخصوص ہے، انھیں جگہ دی ہے، ان کا کہنا بھی یہی ہے کہ قطعات تواریخ و تہنیت کے علاوہ کہ جو ان کے کلیات کے آخر میں چھپے ہیں اور کوئی چیز دستیاب نہ ہو سکی۔ ان کا فارسی کلام عام طور سے رواں اور سہل ہے اس میں اغلاق اور تصنّع کا شائبہ بہت کم ہے انھوں نے فارسی کے مستند شعراء کا، گمان ہے کہ کافی مطالعہ کیا تھا ان کی اردو غزلوں میں فردوسی، سلمان ساوجی، حافظ شیرازی، بیدل، صائب، طالب آملی اور غنی کشمیری کے ایسے اہم شعراء کا ذکر ملتا ہے اور ان میں سے چند شعراء ضرور ایسے ہیں کہ جن سے ان کی اُردو شاعری اچھی خاصی حد تک متاثر بھی ہوئی ہے۔

رسالہ قافیہ

فارسی زبان میں لکھا ہوا ایک مختصر سا رسالہ چھوٹے سائز کے تقریباً تیس صفحات پر مشتمل، ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے یہ رسالہ جو غالباً کبھی چھپا نہیں ہے بغیر کسی تمہید کے شروع ہوتا ہے اور بغیر کسی اختتامیہ کے ختم ہو جاتا ہے اصل رسالہ کبھی لکھنؤ کے ایک رئیس سیّد ابو صاحب کے پاس تھا جس سے آرزو لکھنوی کے والد یاس لکھنوی نے نقل اتاری یہ نقل 1892ء میں حاصل ہوئی اسی ترقیمہ میں یاس لکھتے ہیں کہ 'یہ رسالہ شیخ امام بخش ناسخ کا تالیف کیا ہوا ہے'۔ یہی اس رسالہ کے تالیف ناسخ ہونے کا واحد ثبوت ہے یہ بھی نہیں معلوم کہ اصل نسخہ جس سے یاس نے نقل حاصل کی تھی اس میں بھی اسے تالیف ناسخ ظاہر کیا گیا تھا یا نہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ رسالہ سیّد ابو صاحب تک کیوں کر پہنچا۔ اس رسالہ کا تالیف ناسخ ہونا بہت مشتبہ بات ہے۔ کوئی اندرونی شہادت موجود نہیں ہے۔ رسالہ کا کوئی نام نہیں ہے ناسخ جو دوسروں کے لیے بات بات پر تاریخ کہہ دیتے تھے انھوں نے اس کی کوئی تاریخ کیوں نہیں کہی؟ ناسخ کے شاگردوں اور حلقۂ ارادت میں کوئی ایسا شخص علم میں نہیں ہے جو اس رسالہ کے وجود سے واقف ہو اور وفات ناسخ سے لے کر 1892ء تک یہ رسالہ کہاں غائب رہا کہ کوئی اس سے مطلع نہ ہو سکا یہ اور اسی طرح کی اور بھی باتیں ہیں جن کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی جو چاہے مکمل نفی تک نہ پہنچائیں مگر قوی شبہ تو ضرور پیدا کرتی ہیں۔ یہ رسالہ فی الحال لکھنؤ میں پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

رسالہ کی زبان معمولی فارسی کہی جا سکتی ہے۔ پورے رسالہ میں قافیہ کے انھیں مسائل سے بحث ہے جن کا تعلق فارسی زبان سے ہے صرف ایک جگہ لہجہ ہندیاں اور اردو کے چند الفاظ کا ذکر آتا ہے ورنہ شروع سے آخر تک سب مثالیں بھی فارسی شعر کی درج ہیں

رسالہ قافیہ کے ساتھ ہی فارسی کا ایک اور رسالہ منہاج العروض نامی یاس ہی کا نقل کیا ہوا ملتا ہے اس رسالہ کے مصنف کا یاس نے کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے شاید آئندہ

ناسخ کی طرف اس رسالہ کی نسبت رواج پا جائے بلکہ لاہور سے طبع ہونے والے ایک انتخاب ناسخ میں اس رسالہ کو ناسخ کی طرف منسوب بھی کر دیا گیا ہے۔ یہ رسالہ بھی ناسخ کی تالیف نہیں معلوم ہوتا ہے۔ منہاج العروض اس کا تاریخی نام ہے جس سے 1791ء / 1206ھ نکلتے ہیں ناسخ اس وقت 20 سال کے تھے اور ایسا رسالہ لکھنا ہنوز ان کی حیثیت سے باہر تھا

(۲)

ناسخ نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصّہ خاموش فنی ریاضت میں گزارا تھا اسی لیے وہ تذکرہ نگاروں کی توجہ کا مرکز اور ادبی حلقوں میں ذکر و فکر کا موضوع دیر میں بنے اور جب بنے تو انھوں نے جلد ہی اتنی اہمیت حاصل کر لی کہ انیسویں صدی کے اختتام تک ان کے موافق اور مخالف آرا کا ایک انبار لگ گیا ان کی دل کھول کر تعریف و توصیف بھی کی گئی اور بے محابا تنقیص بھی ہوئی دونوں ہی گروہوں میں معروضیت کم اور ذاتیات کا دخل کافی حد تک رہا ہے لیکن اہم بات یہ ہے کہ ان کے سخت ترین مخالف بھی زیر لب اور بین السطور کسی نہ کسی طرح ان کے معترف نظر آتے ہیں اور اگر مجموعی ردعمل کا خلاصہ نکالا جائے تو ان کے شاندار کارناموں کا اعتراف کسی نہ کسی صورت سے تقریباً سب ہی نے کیا ہے اسی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں محض ایک شاعر کے بجائے اردو ادب کی ساخت و پرداخت میں اہم کردار ادا کرنے والی شخصیت کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے

مصحفی پہلے ایسے اہم شاعر اور تذکرہ نگار ہیں جنھوں نے ناسخ کی اہمیت کو اچھی طرح محسوس کیا۔ اور اردو شاعری کے بدلتے ہوئے افق و رنگ میں ناسخ میں موجود امکانات کا صحیح ادراک کیا۔ انھوں نے ان کا ابتدائی ذکر جبکہ ابھی ناسخ کی عمر تقریباً 37 سال کی تھی اپنے تذکرہ ریاض الفصحا میں کیا۔ انھیں مہذب اور حلیم الطبع کہا اور شاعری کے متعلق

یہ رائے دی کہ وہ اردو کے شاعر ہیں اور معنی تازہ کی تلاش میں رہتے ہیں اسی تذکرہ میں وہ نواب حسین علی خاں اثرؔ کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ ''شیخ امام بخش ناسخؔ نے معنی بندی میں تازہ تازہ علم استادی بلند کیا ہے اور مجھ سے بھی وہ دلی دوستی رکھتے ہیں'' لیکن ناسخؔ کی اصل اہمیت ان کے اس دیباچہ سے ظاہر ہوتی ہے جو انھوں نے اپنے دیوان ششم پر لکھا تھا جس میں وہ اردو شاعری کے تغیّرات وارتقار کا حال اور اس کے بدلتے ہوئے رنگ و آہنگ کا تذکرہ بڑی جامعیت کے ساتھ کرتے ہوے اور میر و مرزا کے عہد کے خصوصیات کا ذکر کر کے ان تغیّرات پر نظر ڈالتے ہیں جو ان کے عہد میں لکھنؤ میں نمودار ہو رہے تھے انھوں نے جدّت اور اختراع و ایجاد کی اس لے کو محسوس کیا جو دھیرے دھیرے لکھنؤ کی خود مختاری کے ساتھ بلند ہو رہی تھی۔ وہ نئے لکھنوی رنگ اور اسلوب کا ذکر کرتے ہوے لکھتے ہیں کہ ''اس اسلوب کا بڑا حصّہ شیخ امام بخش ناسخؔ کی قسمت میں آیا جو محمد عیسیٰ تنہاؔ کے دوست ہیں اور مجھ سے بھی دلی رسوخ رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے تخلص کی مناسبت سے اسم با مسمیٰ بن کر سادگی پسند شاعروں کے طرز پر تھوڑے ہی عرصہ میں خط نسخ کھینچ دیا اور ان کے پیچھے اور قدم بقدم چل کر آتشؔ نے بھی اپنی تیز رفتار فکر کو فلک تک پہنچا دیا اسی طرح کی تیسری فرد طالب علی عیشی کی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا معاندین اور دعویٰ داران (شعر و زبان) بلوں میں روپوش ہو گئے ان کے سر خجالت سے جھک گئے اور اپنے سست کلام سے پشیمان ہو کر مشاعروں میں جانے سے گریز کرنے لگے اور خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا'' پھر مصحفی یہ لکھتے ہیں کہ ''میں بھی پہلے سادہ گویوں میں تھا مگر نئے رنگ کو دیکھ کر اس دیوان ششم کی اکثر غزلیں میں نے انھیں لوگوں کے طرز پر کہی ہیں''۔

اس بیان سے جو کچھ نتیجہ نکل سکتا ہے وہ ظاہر ہے اور لکھنؤ میں ادبی فضا کی وہ تبدیلیاں جو بالآخر ایک خود مختار ادبی مرکز کو وجود میں لانے کا باعث بنیں اور جسے اس عہد کے نوجوان اور جوان فنکاروں کا ایک گروہ نئے احساس و ادراک کی مدد سے

بروئے کار لارہا تھا' ناسخ اس گروہ کے ایسے راہنما بن گئے کہ جس کا اعتراف مصحفی کے ایسے سن رسیدہ شاعر نے کیا' اعتراف ہی نہیں کیا بلکہ تقلید بھی کی۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ جو ناسخ اور غالب کے معاصر تھے اور اچھا تنقیدی ملکہ رکھنے کے ساتھ ساتھ خود بھی اچھے مذاق والے شاعر تھے وہ لکھنؤ کے نہیں تھے بلکہ دہلی میں رہتے تھے اور لکھنؤ کی مقامی سیاست اور ادبی تحریکوں میں نہ ملوّث تھے اور نہ ان سے براہ راست متاثر تھے' دہلوی' ہونے کی وجہ سے انھیں لکھنؤ کے رنگ سے تو وحشت ہونا چاہیے تھی مگر انھوں نے اپنے تذکرہ گلشن بے خار میں نہ صرف ناسخ کو کافی جگہ دی ہے بلکہ ان کی ثنا و صفت کا بھی حق ادا کیا ہے انھوں نے اس تذکرہ میں نمونہ کے طور پر ایک سو ایک اشعار کا انتخاب درج کیا ہے اور یہ سارے اشعار دیوان اول سے چنے گئے ہیں سوائے چند شعروں کے۔ وہ لکھتے ہیں:

'جب میں تذکرہ مکمل کر چکا تو مجھے خبر ملی کہ ناسخ کا دیوان دوم بھی نہ صرف مرتب ہو گیا ہے بلکہ دہلی بھی پہنچ گیا ہے میں اس دیوان سے انتخاب نہ کر سکا ہاں ان کی تازہ غزلوں سے کچھ شعر منتخب کر کے درج کر دیے ہیں' ان غزلوں کو دوستوں نے تحفہ کے طور پر مجھے بھیجا ہے'

اس عبارت سے اندازہ یہی ہوتا ہے کہ ناسخ کی غزلوں کو ایک ایسی جنس گراں مایہ سمجھا جاتا تھا کہ جسے دہلی تحفتہً بھیجا تھا اور ان کا دیوان مرتب ہوتے ہی لکھنؤ سے باہر پہنچنے لگتا تھا۔ خود ناسخ کے متعلق شیفتہ رائے دیتے ہیں کہ 'وہ نہایت عالی پایہ' بلند اندیشہ اور نازک خیال شاعر ہیں اور معنی تازہ و سیراب کی تلاش میں بے مثل ہیں'۔

کریم الدین اس عہد کا مشہور تذکرہ نگار ہے جس نے اپنا تذکرہ 'طبقات الشعرائے ہند' ناسخ کی وفات کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مرتب کیا اگرچہ اس تذکرہ میں بعض باتیں جن کا تعلق ان کے حالات سے ہے غلط درج ہیں مگر ناسخ کے سلسلہ میں عام رائے اور

عام تاثر کو کریم الدین نے صفائی کے ساتھ لکھ دیا ہے ان کا خیال یہ ہے۔

"ناسخ کی استادی اور بلند فکری میں کوئی شک نہیں، ان کے تبحر اور بلند پروازی، اور پُرگوئی میں کسی کو کلام نہیں۔ آتش اور ناسخ دونوں مسلم الثبوت استاد ہیں اور کسی شاعر کی ان دو شخصوں کے سامنے اب ہمارے زمانہ میں قدر نہیں ہے۔ ناسخ کے شاگرد اس کے برابر کسی کو شاعر نہیں سمجھتے۔"

اس بیان سے اس اثر دگیرائی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے جو وفات ناسخ کے بعد بھی کسی اضمحلال کا شکار نہیں ہوئی تھی۔

'تذکرہ خوش معرکہ زیبا' کا مولف ذاتی طور پر ناسخ کے موافق نہ تھا بلکہ ان سے کافی پرخاش رکھتا تھا اس نے عرصہ تک اپنے تذکرہ کا مواد جمع کیا اور اس عہد کے تمام اہم اور بہت سے غیر اہم شعراء سے مل کر اپنی رائے قایم کی اور واقعات درج کیے اس کا ناسخ کے یہاں بھی آنا جانا تھا اس نے اپنے تذکرہ میں براہ راست اور بالواسطہ ناسخ کا ذکر بہت جگہ کیا ہے براہ راست جو کچھ اس نے لکھا ہے اس سے ناسخ کے کمال کے سچے اعتراف کی شہادت فراہم ہوتی ہے وہ انھیں 'رسم کہن کا ناسخ اور علم شعر و سخن کا مجتہد کہتا ہے' اردو میں انھیں صائب و کلیم کی یادگار ٹھہراتا ہے، 'شیریں بیان اور خلاق معانی سمجھتا ہے'۔

سعادت خاں ناصر مولف 'خوش معرکہ زیبا' کے علاوہ جن اہم تذکرہ نگاروں نے بعد وفات ناسخ ان کا ذکر کیا ہے ان میں احمد حسن سحر تخلص بھی اہمیت رکھتے ہیں مبالغہ آرائی سے لبریز لفاظی کے بعد کہ جو اس زمانہ کا دستور تھی وہ کہتے ہیں :

"ناسخ اپنے عہد کے نزاکت بند شاعروں کے استاد تھے انھوں نے اطراف عالم اور عالمیان میں اپنی شاعری کا غلغلہ بلند کیا اور اپنی استادی کا نقارہ بجوا دیا۔ تازہ اور نیا مضمون جتنا ان کے حصہ میں آیا دوسرے شعراء کو خواب میں بھی اس کا پرتو نہیں نصیب ہوا میں نے ان سے خود جو کچھ سنا اور ان کے دیوان میں دیکھا

اس کا انتخاب درج کرتا ہوں ؛

(تذکرہ بہار بے خزاں مخطوطہ ندوہ)

اسی طرح قطب الدین باطن اپنے تذکرہ 'گلستان بے خزاں' میں طویل عبارت آرائی کے بعد لکھتے ہیں :

"کسی کے شاگرد نہیں اور سب کے استاد ہیں۔ جس کا اعتقاد راسخ ہے وہ معتقد ناسخ ہے شیخ کا کلام ہے اعجاز لا کلام ہے"

اس کے بعد انھوں نے 29 اشعار کا ایک انتخاب بھی درج کیا ہے۔ وہ آتش کے زیادہ قایل معلوم ہوتے ہیں مگر فیصلہ کن اور واضح رائے ناسخ کے لیے درج کرتے ہیں۔

گلستان سخن میں قادر بخش صابر دہلوی اپنی پر پیچ عبارت آرائی کے ساتھ ناسخ کا تفصیلی ذکر کرتے ہیں جس کا محصّل مختصر ہے اور تعریف کے ساتھ عیب جوئی کا عنصر شامل ہے وہ اس کا اقرار کرتے ہیں کہ ناسخ لکھنؤ کے خوش سخن اور نام آور کامل فن شاعر تھے اس کی فکر نے معنی کو تاب و بہا اور زبان کو رونق و صفا بخشی تھی۔ اہل انصاف اس کو استاد اور ارباب فہم اس کے شعر کو سحر جانتے ہیں۔ ہر چند اس کا طریقہ تمثیل کا ہے لیکن شعر عاشقانہ اگر زبان سے نکل گیا تو شعلہ شمع کی طرح پروانہ صفت لوگوں کے لیے آتش افگنی کر دیتا تھا"۔

اس کے بعد وہ ناسخ پر دو الزام لگاتے ہیں ایک تو یہ کہ آخر عمر میں انھوں نے بے عقلی کے غلبہ سے جرأت کا رنگ اختیار کیا اور اپنا دیوان ' دفتر پریشان' ایسے ہی اشعار سے بھر دیا اور بعض جگہ ان کے اشعار بے معنی ہو جاتے ہیں۔ یہ خیالات حقیقتہً عجیب و غریب ہیں جرأت کے رنگ اور ناسخ کے رنگ و مزاج میں بہت فرق ہے اور ان کے دیوان دوم یعنی ' دفتر پریشان' پر جس کی تفصیل گزر چکی ہے یہ بات بالکل صادق نہیں آتی۔ اس اعتراض پر، غلط ہونے کی بنا پر بھی اور ناسخ کے وسیع اثرات کی وجہ سے بھی، رد عمل شدید ہوا سیّد مرتضیٰ گستاخ نے اپنی کتاب 'گستاخی معاف' میں لکھا ہے کہ 'شہزادہ صاحب یعنی مرزا

صابر بخش نے ناسخ کو بے معنی اور مہمل گو قرار دیا ہے۔ یہ اعتراض تو کبھی کسی نے کیا ہی نہیں اس دعوائے بے دلیل کا کیا جواب دیا جائے ہاں یہ ضرور پتہ چل گیا کہ ناسخ کے اشعار آپ کی سمجھ سے باہر ہیں'۔ اسی طرح نجم الغنی (بحر الفصاحت ۹۶) نے اس الزام کو نہایت ناملایم قرار دیا ہے بلکہ ان کا خیال ہے کہ ناسخ کا سا اعتبار کسی کو نصیب نہیں ہوا اصول کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے نہیں دیا اردو میں صاحب طرز قرار پائے انھیں ناسخ کہنا بجا ہے کیونکہ ناہموار طرز قدیم کے ناسخ ہیں۔ ان کی طرف سرقہ مضامین کی نسبت نادانی ہے جس شخص کے کئی دیوان کمال نازک خیالی اور مضامین عالی کے ساتھ موجود ہیں وہ بھلا سرقہ کا قصد کرتا۔ اور یوں تو توارد مضامین سے کوئی بشر خالی نہیں ہے'۔

ناسخ کے متعلق اگر ہمدردانہ خیالات کو جمع کیا جائے تو ایک دفتر بن جائے گا دوسروں کے علاوہ خود ان کے شاگردوں نے جو خراج عقیدت نظم و نثر میں پیش کیا ہے اسی کا ضبط تحریر میں آنا مشکل ہے۔

کلب حسین خاں نادر نے 'تلخیص معلی' میں ان کا جس طرح ذکر کیا ہے وہ شاہانہ جلوس کا منظر نگاہوں کے سامنے لاتا ہے وہ انھیں فردوسی زمانہ، خاقانی پایہ، معنی شناس، نقاد مضامین نو وکہن، موسس اساس سخنوری، بانی طرز جدید، واضع قواعد مفید وغیرہ وغیرہ قرار دیتے ہیں اگر اس بیان سے مبالغہ کا عنصر نکال بھی دیا جائے تو جو کچھ بچتا ہے وہ ناسخ کی حقیقی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے۔

ان کے دوسرے شاگرد رشک نے تنہا اپنی عقیدت اور کمالات ناسخ کے اظہار کے لیے جو اشعار نظم کیے ہیں وہ اتنے ہیں کہ شاید ناسخ کے تمام شاگردوں نے مل کر بھی نہ کہے ہوں گے۔ انھوں نے متفرق اشعار کے علاوہ متعدد غزلیں ناسخ کی ردیف کے ساتھ کہی ہیں۔ ؎

شعر گوئی میں ہیں استاد جناب ناسخ ـــــــ معنی آرا سخن ایجاد جناب ناسخ

فصاحت ہو بلاغت ہو کہ تحقیق — نہ ہوگا کوئی تجھ سا ہائے ناسخ
کرا انصاف اے جہاں سفلہ پرور — جئیں منسوخ۔ یوں مرجائے ناسخ

مرگ ناسخ سے فصاحت کو لگا داغ اے رشک — نہ رہی یہ طبع نہ یہ خوبی زبان پیدا
حسن بندش صحت الفاظ مضمون جلید — ناسخ اک اک بات میں اے رشک اکیلا ہوگیا

اسی طرح خواجہ وزیر، برق، قبول اور مظلوم شاہ نے بھی ان کے متعلق اشعار نظم کیے ہیں جو بالترتیب درج ذیل ہیں :

یاد آتے ہیں مجھے حضرت ناسخ جو وزیر — کیا لگا دیتی ہے اشکوں کی جھڑی میری آنکھ

در شعر و سخن مثل نہ داشت — فی الحقیقت ہمہ دان بود ناسخ

ناسخ کہ بود اکمل بہ فن — استاد با ارشاد ما

در اقالیم سخن دانی عدیلش نیست نیست — مثل او در دور خود ہرگز ندیدہ آسمان

تصویر کا دوسرا رخ سامنے لانے کے لیے اس نکتہ چینی، عیب جوئی اور تند خوئی کا بھی کچھ ذکر ضروری ہے جو ناسخ کی حیات میں اور بعد میں ان پر ہوتی رہی۔ چھوٹے چھوٹے بکھیڑوں کو چھوڑ کر ان پر باضابطہ اور مفصّل حرف گیری کرنے والے تاسف ہیں جو ناسخ کے تقریباً معاصر تھے اور قیاس یہ ہے کہ ناسخ کی وفات کے قریب ہی ان کی وفات ہوئی وہ میر شیر علی افسوس 1808ء کے نواسے تھے شاعری کا اچھا ملکہ رکھتے تھے اور علم شعر و موزنی زبان سے بھی واقفیت رکھتے تھے مگر نہ تو ناسخ کی شعر گوئی کے معترف تھے اور نہ ان کی اصلاح زبان

کے قایل تھے انھوں نے اپنا کلام مرتب کیا اور غزلوں کی تعداد کے لحاظ سے اس کا نام 'دیوان صد غزل' رکھا وہ عرصہ تک گوشہ گمنامی میں پڑے رہے اب ان کا دیوان چھپ چکا ہے اس دیوان میں ناسخ کی منظوم ہجو جگہ جگہ موجود ہے اس کے علاوہ انھوں نے اپنے دیوان پر ایک مفصل دیباچہ لکھا ہے جس میں نامور شاعروں میں شاید ہی کوئی بچا ہو جس پر انھوں نے نشتر نہ لگایا ہو میر سودا، مصحفی، آتش، ناسخ سب ہی کو انھوں نے نشانہ بنایا ہے ناسخ پر وہ زیادہ مہربان معلوم ہوتے ہیں ان کے لیے لکھتے ہیں :

> 'انھوں نے بہت سے شاعروں سے استفادہ کیا، ان کو کئی رسالے عروض وقوافی کے یاد ہیں فارسی کے قاعدے بھی جانتے ہیں مگر سب استادوں کی شاگردی سے انکار ہے ــــ ہر چند کہ بڑے بڑے شاعر و ماہر فن لکھنؤ میں موجود ہیں پر جو شہرت اور ناموری ناسخ کو حاصل ہے وہ کسی کے نصیب میں نہیں ہے۔ ان کا مذاق بالکل علیٰحدہ ہے کلام میں لذت چاشنی کی برائے نام بھی نہیں ہے، حلاوت و مزہ وجود نہیں رکھتا۔ الفاظ میں ظاہری چمک دمک ہے لیکن معنوی خرابیوں سے اکثر کلام بے نمک ہے وہ مشکل طبع ہیں دشوار گوئی سے رغبت رکھتے ہیں، فارسی مضامین کا سرقہ کرتے ہیں اور فکر بے اندازہ سے مضامین تازہ کی جستجو کرتے ہیں اور اس میں اس قدر محو رہتے ہیں کہ محاورہ زبان اردو اور مناسب تشبیہ و معنی کا شعر میں کہیں کہیں کوئی دخل نہیں رہ جاتا۔ کوئی غزل ایسی نہیں ہے جس میں کچھ مہمل اور کچھ قابل اعتراض شعر نہ ہوں، شعر کے فن کے طلب گاروں کو چاہیے کہ پرانے شعرا کی سیدھی راہ چھوڑ کر اس کی بتائی ہوئی نئی راہ کہ جو محض کج روی اور گمراہی ہے اختیار نہ کریں، اس کا کلام اونچی دوکان اور پھیکا پکوان ہے'۔

یہ سب کچھ لکھ کر انھوں نے ناسخ کے بارہ شعر منتخب کیے اور ہر ایک کے سقم و عیب کی اپنے خیال میں نشاندہی کی۔ سعادت خاں ناصر صاحب خوش معرکہ زیبا، نے جو ناسخ کا فی نفسہٖ ہمدرد نہیں ہے تاسف کے خیالات پر کڑی نکتہ چینی کی ہے۔ اسی مولف کی شہادت کی بنا پر خود ناسخ کے شاگردوں میں بھی چند کو چھوڑ کر، شیرازہ برقرار نہ رہ سکا اور کئی شاگرد اگرچہ ناسخ سے منحرف نہیں ہوئے مگر اپنے کمال کی فوقیت جتانے لگے ان میں ناصر خواجہ وزیر اور مہدی حسن خاں آباد کا نام لیتا ہے اور بالاخر کہتا ہے:

"افسوس شیخ (ناسخ) کا ہر شاگرد اپنے کو ان سے بہتر جانتا ہے، فقط ناحق شناسی ہے۔ شیخ ہونا تو کہاں پر شیخ چلی تو ہوے۔"

ان اطلاعات کی تصدیق اور کسی ذریعہ سے نہیں ہوتی اطلاعات میں جو تعمیم اور مبالغہ کا عنصر ہے وہ بدیہی طور پر غلط ہے۔

ناسخ کے انتقال کے بعد سب سے بڑی معرکہ آرائی کرنے والے عبدالغفور نسّاخ ہیں جو بنگال کے رہنے والے تھے اور ناسخ سے بہت چھوٹے تھے اس لیے کہ 1833ء میں پیدا ہوئے۔ بعد میں ترقی کر کے ڈپٹی کلکٹر ہو گئے ان کی شادی بھی خاندانِ تیموریہ میں ہوئی تھی پڑھے لکھے اور صاحب استعداد شاعر تھے چونکہ ان کے پاس خود بینی اور خود آرائی کے سارے لوازم فراہم تھے اس لیے شاعری شروع کرنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد مہجور تخلص چھوڑ کر نسّاخ تخلص اختیار کیا اور اپنے ایک شاگرد کا تخلص انسخ رکھا یہ سب باتیں ان کے ذہن میں ناسخ کے خلاف برپا ہلچل کی غمازی کرتی ہیں وہ دو ایک مرتبہ لکھنؤ بھی آئے اور اپنی شان و شوکت اور وجاہت کی بنا پر اس امید میں تھے کہ یہاں کی ادبی فضا پر چھا جائیں گے 1857ء کے بعد لکھنؤ لاکھ لٹ گیا مگر ایسا گیا گزرا بھی نہیں ہوا تھا کہ نسّاخ اور ان کے فن کے آگے سربسجود ہو جاتا۔ نسّاخ یہاں سے کافی مایوس اور برافروختہ واپس ہوے اور اب انھوں نے لکھنؤ کے اساتذہ کے خلاف اور خاص طور سے ناسخ کے خلاف ایک ادبی معرکہ کا آغاز کیا جس کا سلسلہ

عرصہ تک جاری رہا اور اس کی گونج پورے شمالی ہندستان تک پہنچی اس ساری داستان میں مزے کی بات یہ ہے کہ نسّاخ نے اپنے جتنے دیوان مرتب کیے ہیں وہ سب رنگ ناسخ میں ہیں۔ حقیقت میں وہ ناسخ کے معنوی شاگرد معلوم ہوتے ہیں اور ان کے خلاف معرکہ آرائی بھی کرتے ہیں۔

اس معرکہ آرائی کا آغاز یوں ہوا کہ نسّاخ نے ایک رسالہ مرتب کیا اور 'انتخاب نقص' اس کا نام رکھا۔ اس کا موضوع انیس و دبیر کے کلام پر اعتراض تھا۔ پھر انھوں نے اپنے شاگرد انسّخ کے نام سے ایک رسالہ 'طومار اغلاط' چھپوا دیا جس میں لکھنؤ کے چھ اساتذہ کو بشمول ناسخ اعتراضات کا نشانہ بنایا ان دونوں رسالوں نے جن کا لب و لہجہ بھی اچھا نہیں تھا شدید ردِّ عمل پیدا کیا اور پھر مختلف مصنفین کی طرف سے جواب اور پھر جواب الجواب کا سلسلہ شروع ہو گیا اور حسب ذیل کتابیں اور رسالے وجود میں آ گئے۔

سنان دلخراش از منیر شکوہ آبادی، گستاخی معاف از سیّد مرتضیٰ گستاخ، تطہیر الاوساخ از محمد رضا معجز، مسکت شائستہ از سیّد محمد تقی، تفضیح اور جواب اعتراضات از مولوی آغا علی۔

یہ جوابات بھی نہایت سخت تھے اور ان کا جوابی لب و لہجہ زیادہ تر نسّاخ کے لب و لہجہ کے مقابلہ میں خراب تر تھا۔ یہ ساری بحثیں 1877ء کے آس پاس شروع ہوئیں اور تقریباً 1885ء تک چلتی رہیں اور انجام بالآخر وہی ہوا جو ایسی بحثوں کا ہوتا ہے۔ بڑے بڑے علمی نکتے کتابوں میں آ گئے مگر فیصلہ کچھ نہ ہو سکا اب تقریباً ایک صدی گزر جانے کے بعد تاریخ اپنا معروضی فیصلہ دینے کی اہل بن گئی ہے اور یہی فیصلہ حقیقی فیصلہ ہوگا۔ اس صدی میں ناسخ ہی کی اہمیت زیادہ باقی نہ رہی تو بھلا نسّاخ اور انسّخ کس شمار میں آئیں گے۔

انیسویں صدی ہی میں صفیر بلگرامی نے اپنا تذکرہ دو جلدوں میں 'جلوۂ خضر' کے نام سے لکھا یہ تذکرہ مولانا محمد حسین آزاد کی مشہور کتاب 'آب حیات' کا تقریباً معاصر ہے اور اسی عہد میں لکھا گیا کہ جب نسّاخ کی برپا کی ہوئی نزاع چل رہی تھی۔ کہنے کو یہ تذکرہ ہے

مگر اس کا بڑا حصہ ناسخ کی حمایت اور دفاع پر مشتمل ہے۔ ناسخ کی وکالت کرنے والوں میں شاید صفیر بلگرامی سے زیادہ پرجوش کوئی اور نہیں گزرا ہے مگر اب لکھنؤ ہی بدل چکا تھا اور ہندستان میں مجموعی طور پر مغرب سے آئی ہوئی ہوا کے جھونکے چلنا شروع ہو گئے تھے۔ انیسویں صدی کے آخر میں رفتہ رفتہ ناسخ کے متعلق وہ فیصلے نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے جنھوں نے بیسویں صدی میں قطعیت اختیار کر لی۔ اس عہد میں ناسخ کے متعلق معتدل اور یک گونہ سچا فیصلہ دینے والوں میں آزاد کے علاوہ مولانا امداد امام اثر بھی شامل ہیں جن کے خیالات کی ناسخ کے سلسلہ میں اہمیت ہے وہ اپنی تالیف 'کاشف الحقائق' میں لکھتے ہیں:

"شیخ اپنی غزلوں میں زیادہ تر خارجی مضامین باندھتے رہے اس وجہ سے ان کا رنگ درد، میر، مومن، اور غالب وغیرہ سے مختلف ہو گیا۔ انھوں نے غزل کے تنگ دائرہ کو وسیع کیا لیکن بہت سے ایسے مضامین آ گئے کہ شیخ کی غزلیں واردات وجذباتِ قلبیہ سے خارج ہو گئیں۔ ایک ایسی شاعری وجود میں آ گئی جسے نہ قصیدہ کہہ سکتے ہیں اور نہ غزل۔ شیخ بڑے طبّاع اور خلاق سخن تھے۔ ان کی نازک خیالی اور بلند پردازی نادر انداز رکھتی ہے' ان کا کلام متانت، جلالت، شوکت، حشمت، تہذیب و وقار سے پر ہے۔ دشوار مضامین کو آسانی کے ساتھ باندھ جاتے ہیں ان کے لفظوں کی نشست عقد مروارید کا حکم رکھتی ہے ان کی تشبیہیں اکثر بلند خیالی کی داد دیتی ہیں اس پر بھی کبھی کبھی پھیتی بن جاتی ہے' مبالغہ کی طرف ان کا میلان ہے لیکن جب مبالغہ پردازی اعتدال سے باہر ہو جاتی ہے تو شیخ سے فطرت کی راہ چھوٹ جاتی ہے۔"

وہ یہ بھی لکھتے ہیں:

"حضرت ناسخ حضرت غالب سے قابلیت شاعری میں کبھی کم نہ تھے مگر خارجی پہلو

برتنے کے باعث ان کی غزل غزلیت کا مزا نہیں دیتی۔ علاوہ فصاحت بلاغت کے شیخ کا کلام پُراز تہذیب ہے کوچہ گردی اور فسق و فجور کے مضامین نہیں باندھتے۔ وہ استاذ الاساتذہ ہونے کا استحقاق رکھتے ہیں ان کے ایک بڑے نامور شاعر ہونے میں کسی صاحب عقل و تمیز کو گفتگو نہیں ہو سکتی۔ شیخ کی ذات پر لکھنؤ بلکہ تمام ہندستان کو فخر و مباہات کرنا بجا ہے۔"

آزاد نے ناسخ کے متعلق کافی تفصیل مہیا کی ہے اور ان اعتراضات کا بھی جامعیت کے ساتھ ذکر کیا ہے جو ناسخ پر وارد کیے جاتے ہیں یہ اعتراضات وہی ہیں جن کا ذکر کسی نہ کسی صورت سے اس مطالعہ میں ہو چکا ہے یعنی ان کی نازک خیالیاں کوہ کندن اور کاہ برآوردن ہیں، وہ ایسے سنگین الفاظ استعمال کرتے ہیں جنھیں غزل کی نزاکت برداشت نہیں کر سکتی وہ ایسے ایسے تصرفات کر جاتے ہیں جو اشکال سے خالی نہیں ہیں اور وہ فارسی کے اشعار کا سرقہ کر لیتے ہیں جس کی دو مثالیں بھی پیش کی جاتی ہیں مگر فیصلہ یہی کرتے ہیں کہ ایسے صاحب کمال پر کہ جس کے اشعار ایک مجلد بھر موجود ہیں، اس پر سرقہ کا الزام لگانا انصاف کی آنکھوں میں خاک ڈالنی ہے اور بتاتے ہیں کہ سوداؔ اور میرؔ کے اشعار بھی استادوں سے لڑ گئے ہیں جو جواب ان کا ہے وہی جواب ان کا بھی ہے ان کی مجموعی رائے وہی ہے کہ جو درست اور مناسب کہی جا سکتی ہے "غزلوں میں شعرکت الفاظ اور بلند پردازی اور نازک خیالی بہت ہے اور تاثیر کم ہے صائبؔ کی تشبیہ و تمثیل کو اپنی صنعت میں ترکیب دے کر ایسی دست کاری اور مینا نگاری فرمائی کہ بعض موقعوں پر بیدلؔ اور ناصر علی کی حد میں جا پڑے اور اُردو میں وہ صاحب طرز قرار پائے۔ انھیں ناسخؔ کہنا بجا ہے کیونکہ طرز قدیم کو نسخ کیا جس کا خود بھی انھیں فخر تھا۔ ان کے کلام میں تصوف بھی ہے مگر اس کا رستہ کچھ اور ہے جس سے وہ واقف نہیں۔ انھیں نازک خیالیوں میں جو صاف شعر بھی زبان سے نکل گیا ہے ایک تیر ہے کہ نشانہ کے پار جا کر اڑا ہے اٹک کر ترازو بھی نہیں ہوا۔"

(آب حیات بضمن ناسخ)

سیکڑوں آہیں کروں پر دخل کیا آواز کا ۔۔۔ تیر جو دے وے صدائے نفس تیرانداز کا
ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو ۔۔۔ کیسے تیرانداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

ہر چند کہ ناسخ کے یہاں اس سے کہیں بہتر شعر موجود ہیں اور مثال میں پیش کیے جا سکتے ایسے اشعار خود اس مطالعہ میں جا بجا موجود ہیں مگر آزاد کا انتخاب بہر حال یہی ہے۔ وہ اس بات کے بھی معترف ہیں کہ شروع میں لکھنؤ دہلی کا متبع تھا اور فصحائے لکھنؤ دہلی کے محاورہ کو فخر سے قبول کرتے تھے لیکن رفتہ رفتہ "شیخ صاحب اور خواجہ حیدر علی آتش کے کمال نے لکھنؤ کو دِلّی کی قید پابندی سے آزاد کر کے استقلال کی سند دی اور وہی مستند ہوئی اب جو چاہیں کہیں ہم روک نہیں سکتے۔"

(آب حیات بضمن ناسخ)

بیسویں صدی ظاہر ہے کہ نئے رنگ اور نئی رفتار کے ساتھ طلوع ہوئی اور ناسخ کے متعلق وہ رائے جو ان کے عہد میں تھی یا ان کے انتقال کے بعد برسوں رائج رہی از خود بدلنے لگی اب نہ دِلّی رہی اور نہ لکھنؤ بلکہ ادب اور زندگی کا ربط اصل محورِ فکر قرار پایا مگر اس صدی میں بھی ناسخ کے خلاف جو کچھ کہا گیا وہ تقریباً انھیں آوازوں کی پھیلی ہوئی بازگشت ہے جو پہلے بھی بلند ہو چکی تھیں ان کی شاعری کو منسوخ کہا گیا جب وہ عہد ہی منسوخ ہو گیا تو اب ان کی شاعری کو کون کہے۔ ناسخ اور ان کے رنگ کے تمام شعرا ایسے کلاسیک کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں کہ ان کی مکمل منسوخی کا کوئی سوال نہیں۔ اسلوبِ شاعری ان سے آگے بڑھ گیا اور مختلف ہو گیا اور ایسا ہونا ناگزیر بھی تھا مگر لسانی اصلاحات اور ان کی وضع کی ہوئی بوطیقا اب بھی ایک زندہ قوت ہے اور اس کی ایسی تاریخی اہمیت ہے کہ جسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے اس لیے کہ اس کی فیض رسانی کا سلسلہ اب بھی جاری ہے اس وقت بھی اگر زبان و بیان کا کوئی مسئلہ درپیش ہو تو ان کا دیوان عمدہ سند بلکہ شاید اردو کے تمام شاعروں کے مقابلہ میں بہتر اور معتمد تر سند کا کام دے گا۔ اسی چیز میں انکی حاکمانہ قدرت اور ان کے وسیع اصلاحی نظریات کا راز اور قوت پوشیدہ ہے۔

موجودہ عہد میں بھی جن لوگوں نے ناسخ پر اظہار خیال کیا ہے ان کی تعداد بہت ہے ان میں بعض اہم نقاد بھی شامل ہیں ان کے خیالات میں وہ تندرد عمل بھی موجود ہے جو توقع کے مطابق ہے اور ان کی استادی اور عہد سازی کا اعتراف بھی ہے جو تاریخی حقیقت یا مجبوری ہے۔ ان خیالات کا جائزہ لینا اس محل پر ممکن نہیں ہے یہاں صرف نیاز فتحپوری اور فراق گورکھپوری کے خیالات کا ذکر کر کے اس بحث کو تمام کر دینا مقصود ہے۔

اب سے کوئی پچاس ساٹھ سال پہلے نیاز نے ناسخ کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا:

"لکھنؤ کا مشہور ترین شاعر (ناسخ) جس نے عمر بھر میں صرف گیارہ شعر لکھے۔"

(نگار جنوری 1935)

پھر انھوں نے اپنی پسند کے گیارہ شعر نقل کر دیے ہیں یہ دعویٰ اور اشعار کا ایسا انتخاب خود ہی ایسا غیر منطقیانہ ہے کہ جسے سوائے تنقیدی مغالطہ کے اور کیا کہا جائے۔

پھر وہ مزید لکھتے ہیں:

"اس میں شک نہیں کہ ناسخ کا وجود شاعری میں ایک مرض متعدی کی حیثیت رکھتا تھا جو صرف لکھنؤ تک محدود نہیں رہا بلکہ اس نے دہلی کو بھی تباہ کر دیا شاہ نصیر اور ذوق کے علاوہ اور شعراء نے بھی اس طلسم بندی کو اختیار کیا۔"

اس کے بعد انھوں نے تھوڑی رعایت گویا برتی اور (انتقادیات 631) میں لکھا:

"ان کی (ناسخ) غزل گوئی یکسر آورد و تصنع تھی رعایت لفظی، شوکت الفاظ مبالغہ اور بیجا بلند پردازی ان کا خاص فن تھا ان کی غزل گوئی بالکل میکانکی قسم کی تھی جو صحیح جذبات سے کوئی تعلق نہ رکھتی تھی۔ ناسخ کے استاد ہونے میں کوئی شک نہیں مگر ان کی استادی صرف فن و زبان تک محدود تھی کبھی کبھی خدا معلوم کس عالم میں وہ اپنے رنگ سے ہٹ کر جذباتی شعر بھی کہہ

جاتے تھے۔" مثلاً ؎

مانع صحرانوردی پاؤں کی ایذا نہیں
دل دکھادیتا ہے لیکن ٹوٹ جانا خار کا

جون 1938 کے نگار میں ناسخ پر فراق گورکھپوری کا بھی ایک مضمون ملتا ہے جس کے مختصر اقتباسات دلچسپی سے خالی نہیں ہیں:

"ناسخ کا نام آتے ہی کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کرنا اور لیڈری کرنا ناسخ کا پیدائشی حق تھا۔ اس شخص میں وہ تیور ہے جو اردو کے تمام مشاہیر میں ہمیں صرف میر کی یاد دلاتا ہے۔ بحیثیت شاعر کے نہیں بلکہ بحیثیت ایک انسان کے ناسخ کو میر کا مزاج ملا تھا۔ انگریزی ادب کی تاریخ میں ناسخ کی شخصیت بن جانسن اور ڈاکٹر سیموئیل کی یاد دلاتی ہے ــــ اگر میر کی نازک دماغی مسلم ہے اور آتش کا بانک پن تو ناسخ کا ٹھوس ہونا بھی تسلیم کرنا پڑے گا ــــ ناسخ پورے ہندستان پر چھا گیا تھا اور اس کے حریف بھی اس کا اثر لیے بغیر نہ رہے۔ وہ کسی ماحول کسی ملک اور کسی زمانہ میں ہوتا تو بھی اس کی ہستی غیر معمولی ہستی مانی جاتی ــــ ناسخ کا کلام چٹان کی طرح ٹھوس سہی لیکن یہ چٹان اتنی خشک اور بے فیض نہیں کہ ٹھوکر ماریں تو اس سے صاف شفاف چشمے بھی نہ ابل پڑیں۔"

ان سارے بیانات و خیالات سے صحیح صورت حال کا دریافت کرلینا کچھ مشکل نہیں ہے۔ ناسخ کی قدآوری میں کوئی شبہ نہیں ہے ان کی تاریخی اہمیت بھی مسلم ہے بحیثیت ایک ادب ساز کے ان کا مرتبہ اور ان کی سعی کے اثرات ابھی چل رہے ہیں اردو زبان کے ابلاغ اور ہیئت کو مستحکم کرنے کے سلسلہ میں انھیں فرد ہونے کے بجائے ایک ادارہ کی اہمیت حاصل رہی ہے اور زمانہ و انقلابات کے بہت سے نشیب و فراز نمودار ہونے کے باوجود یہ اہمیت کسی نہ کسی حیثیت سے عہد جدید

میں بھی قائم ہے جس طرح تغیرات وارتقار کے باوجود ادب وزبان کے سلسلہ میں لغت کی اہمیت اور ضرورت ہمیشہ باقی رہتی ہے اور جس طرح زبان کے قواعد اور شعری قوانین کی طرف رجوع کرنا خصوصاً اختلاف کے موقع پر لازمی ہوتا ہے اسی طرح ناسخ کی طرف بعض حالات میں رجوع ضروری ہے وہ اب شاعر دل سوز نہ سہی مگر لغت، قواعد اور دستور کی کتاب اب بھی ہیں۔

(۳)

تاریخ ادب اردو میں ناسخ کی اصلی اہمیت ان کے فروغ دیے ہوئے ادبی اور لسانی اصلاحات کی وجہ سے ہے۔ ان کے ادبی اصلاحات نے شعرگوئی کے قوانین اور ضابطوں میں قطعیت پیدا کی اور مجموعی طور پر ایک کلاسیکی بوطیقا مدوّن کی جواب بھی معیار بندی اور مستند حوالہ کا کام دے رہی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ناسخ نے فن شعر پر کوئی کتاب لکھی ہو اور نہ یہ بات ہے کہ ناسخ سے پہلے شعرگوئی کے اصول وجود ہی نہ رکھتے تھے، سارے ضابطے موجود تھے مگر قدما ان کی پابندی کرتے تھے اور نہ ان کے فروغ واستحکام میں کچھ زیادہ دلچسپی رکھتے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا دور ایک عبوری دور تھا جس میں اچھا ادب تو پیدا ہونے لگا تھا مگر قواعد شاعری کے متعلق زیادہ تر انفرادی رجحانات اور ذاتی معیار کام دیتے تھے ناسخ نے ان ضوابط پر غور وفکر کے بعد ان کو ذاتی حدود سے نکال کر کلیات اور اصول کے دائرہ میں پہنچا دیا۔ انھوں نے کسی چیز کی ایجاد نہیں کی بلکہ بے راہ رویوں کا انسداد کیا سیدھی راہ کے نشانات بنائے اور شعری کارواں کے لیے ایک جرس فراہم کیا جس پر شعرار بغیر بھٹکے ہوئے چل سکیں۔ یہ اصول نہ دائمی ہیں اور نہ حرف آخر زمانہ انھیں بدلتا جائے گا اور نئے اصلاحات ظہور پذیر ہوتے رہیں گے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک بنا ہوا قاعدہ ہمیشہ چلتا رہے صرف یہ ضروری ہے کہ کوئی نہ کوئی لائحہ عمل ضرور موجود ہونا چاہیے۔ قدما کے یہاں معروضی قاعدے اور لائحہ عمل

انتہائی انتشار کے عالم میں تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج بھی مجموعی طور پر قدماء کی شاعری میں نہیں بلکہ ایک ہی بڑے شاعر کے یہاں مثلاً حاتم، میر، سودا، میر سوز وغیرہ کے یہاں متضاد شعریات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے اور صحت و غلطی دونوں کی نظیریں ایک ہی غزل گو کے یہاں سے بڑے پیمانہ پر نکالی جاسکتی ہیں۔ عہد ناسخ میں یہ انتشار کم ہوا اور ضوابط اتنے مقرر ہو گئے کہ جتنا امکان میں تھا۔

ناسخ کا دوسرا کارنامہ جو اصلاح و وضع بوطبقا سے مربوط ہے اصلاح زبان کا ہے۔ ان کی اصلاح زبان کے متعلق اس مطالعہ میں اتنے اور مسلسل اشارے موجود ہیں کہ یہاں بہت سی چیزوں کا تفصیلی ذکر حذف کیا جاسکتا ہے پھر بھی دکنی عہد سے لے کر عہد ناسخ تک اردو زبان اور ادب کے ارتقار اور نشو و نما کے اس بسیط افق کا اختصار کے ساتھ جائزہ لینا ضروری ہے کہ جس کے ایک کنارے پر ناسخ واقع ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان کی آفرینش و ارتقار میں جو غیر معمولی اور یک گونہ غیر منظم اسباب شریک رہے ہیں ان کی وجہ سے اس زبان کو شائستہ ادب بننے میں کچھ تاخیر ہوئی اس کا آغاز شمالی ہندوستان میں ہوا مگر پیدائش کے گویا فوراً بعد یہ دکن پہنچ گئی اور وہاں جلد ہی ادبی مقاصد کے لیے استعمال ہونے لگی، وہاں اس کی پرورش و پرداخت ایسے خاص جغرافیائی اور تاریخی حدود میں ہوئی کہ جس نے اس کے خط و خال کو بڑی حد تک متعین کر دیا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد تاریخی اسباب ہی کی بنا پر دکنی اُردو شمالی ہندستان میں پہنچی، تو اس کے محاورے اور لب و لہجہ میں کافی فرق اور اجنبیت محسوس کی گئی یہاں اٹھارویں صدی میں سماجی حالات اردو ادب کو باقاعدگی کے ساتھ پیدا کرنے کے لیے ساز گار ہو چکے تھے مگر عجیب الجھن یہ تھی کہ یہاں کوئی مناسب ترقی یافتہ زبان نہ تھی چنانچہ اٹھارویں صدی کا پورا عرصہ تقریباً اس جدوجہد میں گزر گیا کہ دکنی کو شمالی ہندستان کے مزاج کے مطابق بنایا جائے اور دلّی میں جو ریختہ رائج ہو رہا تھا اس میں سے دکنی اثرات کو اس حد تک خارج کیا جائے کہ وہ یہاں کے شعر و ادب کے لیے قابل قبول بنے چنانچہ اصلاح زبان کا پہلا دور تو اسی وقت سے چل پڑا کہ جب دلّی کی

شاعری کا چرچا دہلی اور اس کے اطراف میں پھیلا پھر زبان کی اصلاح کے سلسلہ میں اٹھارویں صدی میں شاہ حاتم (وفات 1783ء/1197ھ)، مظہر جان جاناں 81-1780ء/1195ھ قائم چاندپوری (94-1793ء) میر تقی میر 1810ء اور مرزا سودا نے 81-1780ء اچھی کوشش کی۔ انھوں نے ریختہ کو غزل کے مزاج کے مطابق بنایا۔ جب لکھنؤ میں اٹھارویں صدی کے اختتام تک ایک نیا ادبی مرکز وجود میں آیا تو یہی اصلاح شدہ زبان جو دہلی سے یہاں مہاجر شعراء کی مدد سے زیادہ تر پہنچی تھی۔ ادبی مقاصد کے لیے استعمال ہونے لگی مگر جلد ہی یہاں شاعروں اور ادیبوں کی خالص لکھنوی نسل بھی نمودار ہوگئی، جس نے اس زبان میں وہی انتشار اور بدنظمی کی کیفیت محسوس کی جو دہلی میں شاعروں نے اس وقت محسوس کی تھی کہ جب یہ زبان دکنی کی شکل میں وہاں تازہ تازہ پہنچی تھی اور جس طرح اس وقت اصلاح کی ضرورت محسوس ہوئی تھی اسی طرح اب لکھنؤ میں اس زبان میں اصلاح کی ضرورت بڑے پیمانہ پر محسوس ہوئی۔ نیا لکھنؤ بن رہا تھا جس کی آرائش و زیبائش اور حسن و تناسب کے سلسلہ میں بالکل نئے تصوّرات برسرعمل تھے انھیں تصوّرات کا دخل زبان، روزمرّہ اور شعرگوئی کے اسلوب میں بھی نمودار ہو رہا تھا۔ ان حالات نے لکھنؤ میں اصلاح زبان کو سماجی اور نفسیاتی حیثیت سے ناگزیر بنا دیا چنانچہ ایک نیا اور موثر حلقہ 'نئے ادبی ترکوں' کا پیدا ہوا جس کے راہ نما ناسخ بن گئے اور اس لیے ان اصلاحات کو جو حقیقۃً سماجی تقاضوں کی بنا پر ادیبوں کی ایک بڑی جماعت نے رواج دیا تھا، ناسخ کی طرف منسوب کر دیا گیا۔ ان ادیبوں یا ناسخ نے کوئی چیز حقیقۃً ایجاد نہیں کی اور نہ زبان ایجاد کی جاتی ہے، اصلاح زبان کا فقط مطلب یہ ہے کہ بولے جانے والے ذخیرہ میں سے، الفاظ و مرکبات کے ڈھیر میں سے چن کر ایسے اجزا کو منتخب کر لیا جائے جو ابلاغ، جمالیات اور ذوق سلیم کے نقطہ نظر سے نئے استعمال کرنے والوں کو زیادہ مفید اور کارآمد معلوم ہوں۔ ناسخ کا اصلاحی عمل یہی تھا انھوں نے جو کچھ اختیار کیا اس کے پیچھے سماجی اجازت موجود تھی جو کچھ انھوں نے ترک کیا وہ سماج اور زبان میں خود ہی متروک ہو رہا تھا اس سلسلہ میں کہیں کہیں معمولی غلطیوں کا

ارتکاب تو ہو سکتا ہے اور ہوا بھی ہے مگر مجموعی طور پر جو کچھ ہوا وہ نہ صرف سماجی تقاضوں کے مطابق تھا بلکہ اردو زبان کی فطرت کے بھی مطابق تھا۔ دہلی میں یہ زبان ترقی یافتہ بن چکی تھی پھر بھی اس میں حشو و زواید اور کافی ڈھیلا پن موجود تھا کہیں کہیں یہ غبار آلود اور زنگ خوردہ اور کھردری تھی اس لیے اس زبان پر ایک آخری صیقل اور رندے کی ضرورت تھی یہ کام دہلی میں ہونا مشکل تھا اس لیے کہ وہ شعری روایات کے بوجھ سے دبی ہوئی تھی لکھنؤ ہی اس کام کے لیے مناسب تھا جہاں آزاد ذہن اور دہلوی روایات سے یک گونہ بے نیاز فکر والے ادیب پیدا ہو رہے تھے۔ چونکہ لکھنؤ میں یہ عمل زبان کے سلسلہ میں حقیقی افادیت رکھتا تھا اس لیے یہاں کے اصلاحات کو بڑی حد تک دہلی میں بھی قبول کر لیا گیا اور پورے ہندستان میں تو اسے اور بھی آسانی کے ساتھ مان لیا گیا۔ میر اور سودا بہت بڑے شاعر تھے لیکن آج بھی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اگر ان کے پاس ویسی چست اور ابلاغی ضرورتوں کو خوبی کے ساتھ پورا کرنے والی زبان موجود ہوتی کہ جیسی ناسخ و آتش کے پاس تھی تو یہ دونوں اور بھی بڑے شاعر ہوتے۔

ناسخ نے اصلاح زبان کے سلسلہ میں خاص طور سے ان گوشوں کو پیش نظر رکھا جہاں انتشار اور بدنظمی زیادہ تھی۔ حشو و زواید کا استعمال ابلاغ کے جمالیات کو برباد کر دیتا ہے۔ قدما کے بہت سے اچھے شعرا اسی عیب کے فریادی ہیں ناسخ نے جھول جھال کو دور کیا اظہار و ابلاغ کو چست بنایا جس سے فطرتاً بیان میں جمالیاتی خوبیاں پیدا ہو گئیں انھوں نے فصحار کے تلفظ اور محاورہ کو معتبر مانا چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو لیکن اگر فصحار کے مابین استعمال میں انتشار ہو تو اس کے علاوہ اور صورت ہی کیا ہو سکتی ہے کہ الفاظ کی صحت لغوی کو معتبر مانا جائے۔ چنانچہ انھوں نے لغوی صحت پر زور دیا۔ یہ بھی انھوں نے تصفیہ کیا کہ غیر زبان کے الفاظ دبنے نہ پائیں مقامی الفاظ نہ دبیں تو اچھا ہے ورنہ کم سے کم دبیں چونکہ اردو زبان مختلف زبانوں کے ذخیرہ الفاظ سے وجود میں آئی ہے لہٰذا ہر زبان کا ہر لفظ اردو ہو جائے اور استعمال کیا جا سکے،

یہ ممکن نہیں ہے اردو کے مخصوص مزاج اور فطرت کو دیکھتے ہوئے مقامی بولیوں اور فارسی و عربی کے بہت سے الفاظ جنھیں نادانستہ اردو شعر میں استعمال کر لیا گیا تھا اور وہ تنافر غرابت اور جمالیاتی حس یا ذوق سلیم پر گراں گزرتے تھے انھیں ترک کر دیا جائے۔ جمع کے قاعدے یکساں اور درست ہوں عطف و اضافت کسی ضابطہ کے ماتحت ہو اپنی ذاتی پسند اور ناپسند پر نہ ہو۔ ذم اور ابتذال کا پہلو زبان سے نہ ظاہر ہو۔ اسمار کے علاوہ افعال بھی جعلی کم سے کم استعمال ہوں اور اگر ان میں توسیع ہو تو ذوق سلیم کے مطابق ہو۔ گردان درست ہو حروف روابط اور افعال ناقصہ بندش میں خرابی نہ پیدا کریں جملوں کی ساخت بے شکن ہو اور تعقید کا کہ جو قدما کے یہاں بہت ملتی ہے شعر میں گزر نہ ہونے پائے۔

یہ ساری باتیں کسی ایسی ادبی تاخت و تاراج کی نشاندہی نہیں کرتی ہیں کہ جس کی بنا پر ناسخ کو زبان اردو کو نقصان پہنچانے والوں میں محسوب کیا جائے ان اصلاحات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناسخ نہ صرف اردو زبان کی فطرت سے خوب واقف تھے بلکہ ضرورت اور افادیت کے مسائل پر بھی اچھی نظر رکھتے تھے۔ قانون اور ضابطے ہمیشہ کچھ آزادیوں کو سلب کرتے ہیں۔ ناسخ کے بنائے ہوئے ضابطوں سے بھی ایسا ہی ہوا مگر زبان کے حق میں یہ بات زیادہ تر فائدہ مند رہی۔ ناسخ کے اصلاحات کو عام طور سے کشادہ دِلی کے ساتھ قبول کیا گیا پھر بھی ان کے اصلاحات کو اعتراض و تعریض کا نشانہ بنایا گیا۔ ان میں کچھ تو ناسخ کے وہ معاصرین شامل ہیں جو پرانی عادتوں کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے اور کچھ معاصرانہ چشمکوں کی وجہ سے ناسخ سے زبان ہی کے معاملہ میں نہیں بلکہ ہر معاملہ میں اختلاف کرنے میں مسرت محسوس کرتے تھے انھیں تو ناسخ کے تخلص ہی پر اعتراض تھا اور وہ یہ پروپیگنڈہ کرتے تھے (مثلاً تاسف) کہ انھوں نے تمام بزرگ شاعروں کو گویا غلط ٹھہرایا اور ان کی زبان کو غیر معیاری کہا حالانکہ ایسی کوئی بات نہ تھی۔ ان باتوں سے قطع نظر ناسخ کی اصلاح زبان اور خود ان کی زبان پر سکہ بند اعتراضات ہوتے رہے ہیں جن کا سلسلہ الفاظ بدل بدل کے کوئی ایک صدی سے جاری ہے۔ مثلاً ناسخ نے دہلی اور لکھنؤ

کی زبان میں تفرقہ ڈال دیا۔ قدیم شعرا مضمون کے پابند تھے اور اسی پر زور دیتے تھے ناسخ نے الفاظ اور بیان کے اصول پر زور دیا اس لیے شعر کی روح نکل گئی۔ انھوں نے ایسے الفاظ اور ترکیبیں ترک کر دیں جن کا بدل وہ نہ دے سکے ان کی اصلاحوں کی وجہ سے زبان کا دائرہ تنگ ہوگیا۔ یہ سب ہی اعتراضات سست بنیاد ہیں۔ ناسخ نے مضمون پر توجہ دینے سے روکا نہیں ہے۔ معنی و مضمون تو ہر شاعر کا انفرادی معاملہ ہے۔ مستند الفاظ اور تراکیب اور زبان کی فی نفسہٖ خوبی ایسی باتیں ہیں جن میں سب شریک ہو سکتے ہیں ان کے متروکات کی جو فہرست بتائی جاتی ہے وہ عام طور سے پندرہ بیس الفاظ سے زیادہ نہیں ہے اتنی مختصر سی تعداد کے عہد ناسخ میں حذف ہو جانے سے زبان پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا ان کے مقابلہ میں ناسخ سے پہلے جن بڑے شاعروں نے جو جو الفاظ یا ترکیبیں ترک کر دی تھیں ان کی فہرست ناسخ کے متروکات سے حقیقتہً بڑی ہے۔ ناسخ نے صرف مقامی نہیں اس سے زیادہ عربی و فارسی کے الفاظ ترک کیے ہیں یہ صحیح ہے کہ انھوں نے اردو شعر کی بنیاد فارسی کے کینڈے پر رکھنے کی کوشش کی مگر یہ بھی تو بتایا جائے کہ اس وقت کونسی مقامی زبان چستی اور نفاست میں اتنی مکمل تھی کہ اس پر اردو شاعری کا کینڈا رکھا جاتا۔ مقامی زبانیں خود ہی انتشار زدہ تھیں اور اور اس کا علاج یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اردو کی انتشار زدگی کو دور کرنے کے لیے اس سے زیادہ انتشار زدہ مقامی زبانوں کا سہارا لیا جاتا۔ پھر اس کے علاوہ اردو میں شاعری کرنے والے نمایاں فنکار جتنی اچھی واقفیت فارسی سے رکھتے تھے اتنی مقامی بولیوں سے نہیں رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصلاحات ناسخ سے زبان کا دائرہ تنگ نہیں ہوا اور جتنا تنگ ہوا اس کی نئے الفاظ کے داخلہ سے تلافی بھی ہوگئی اور بہت سی نئی ترکیبوں نے کمی پوری بھی کر دی۔ دراصل عہد ناسخ کے بعد ان کے اور آتش کے شاگردوں نے اصلاح میں کچھ افراط سے کام لیا اور زبان کے دائرہ کو تنگ تر اور اس کے استعمال کے اصول زیادہ سخت کر دیے۔ ہمیں ہمیشہ اصلاح ناسخ اور اصلاح بعدِ ناسخ میں فرق کرنا چاہیے۔ بعد ناسخ تو لوگوں نے بہت سے ان الفاظ اور

ترکیبوں کو بھی ترک کیا کہ جنھیں ناسخ خود استعمال کر گئے تھے۔ ایک طرف ناسخ پر زبان کو تنگ کرنے کا الزام ہے دوسری طرف نامانوس اور اجنبی الفاظ و تراکیب فارسی و عربی کے افراط کے ساتھ استعمال کرنے کا بھی الزام ہے اس سلسلہ میں ثقیل و اجنبی الفاظ کی فہرست بھی دی گئی ہے (مرآۃ المصنفین محمد یحییٰ) یہ فہرست اگر بڑھا بھی لی جائے تو تین چار درجن الفاظ سے زیادہ پر شاید مشتمل نہ ہو۔ اس اعتراض کا بھی حال یہ ہے کہ ثقیل اور اجنبی الفاظ کا معیار آج کل کا علم و ذوق نہیں ہوسکتا ناسخ کے عہد میں تعلیم کی نوعیت اور معیار پر غور کرنا چاہیے وہ عربی و فارسی کی تعلیم کا دور تھا آج جو لفظ غیر فصیح اور ثقیل معلوم ہوتا ہے وہ لازم نہیں ہے کہ ناسخ کے عہد میں بھی ایسا ہی رہا ہو عین ممکن ہے کہ اس زمانہ میں نہ صرف فصیح سمجھا جاتا ہو بلکہ عام گفتگو میں رائج بھی رہا ہو۔ اس کے علاوہ بالکل معروضی جائزہ سے اور اعداد و شمار کی بنیاد پر یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ اگر میرؔ، مرزا، شاہ نصیر، ذوقؔ اور غالبؔ کی استعمال کردہ ثقیل، اجنبی اور نامانوس ترکیبوں اور الفاظ کی علیحدہ علیحدہ فہرست مرتب کی جائے تو ان کے مقابلہ میں ناسخ کے کلام سے ایسی ہی مرتب کی ہوئی فہرست نسبتہً مختصر ہوگی۔

اصلاحِ زبان کے سلسلہ میں ناسخ کے کارناموں پر خود ان کے عہد میں اور بعد میں برابر اچھے خیالات اور پسندیدگی کی رائیں اکثریت کے ساتھ نمودار ہوتی رہی ہیں۔ ان کی کثرت کی وجہ سے یہ امکان نہیں ہے کہ ان میں سے کسی بڑے حصّہ کو یہاں نقل کیا جاسکے صرف چند رائیں ذکر کی جاتی ہیں۔ صفیر بلگرامی کا بیان ہے:

> غالب سے ایک دن کچھ دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا ذکر آ گیا فرمایا میاں اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو زبان کو زبان کر دکھایا تو لکھنؤ نے اور لکھنؤ میں ناسخ نے ورنہ بولنے کو کون نہیں بولتا اب جس کا جی چاہے تراش خراش روز کرے مگر میرے نزدیک وہ تراش خراش کی جگہ ہی نہیں چھوڑ گیا ـــــ ناسخ کے کلام نے دہلی میں آکر سب کو حیران کر دیا اور قاعدے کے ساتھ مطلب کا واضح طور سے ادا ہونا۔

دلوں کو برانگیختہ کرنے لگا یہاں تک کہ شعرار نے ادھر رغبت کی نگاہ سے دیکھا۔

(جلوہ خضر جلد اول)

حسرت موہانی اپنے استاد کے استاد نسیم دہلوی کے متعلق لکھتے ہیں :

"مرزا نسیم کے انصاف کو بھی دیکھنا کہ باوجود اپنی آن بان اور دعوائے فصاحت کے متروکات کے معاملے میں ناسخ کے تتبع کو کبھی موجب عار نہیں خیال کیا اور ان کے انتقال کے بعد بکمال بے تعصبی لکھ دیا ؎

ناسخ مغفور تھا استاد یکتا اے نسیم لکھنؤ والوں میں وہ سب سے نرالا ہو گیا

(اردوئے معلیٰ نومبر 1903ء)

میر محمد زائر جس نے ناسخ کو بہت دیکھا تھا کہتا ہے :

"فی الحقیقت فن شاعری اور تحقیق و تصحیح الفاظ میں ان کا نظیر نہ تھا۔"

(قیصر التواریخ ۲/۷۲)

امداد امام اثر (کاشف الحقائق 76/2-157) اصلاح ناسخ کے زبردست حامیوں میں ہیں اور ان کا ذکر مختلف مقامات پر اور تفصیل سے کرتے ہیں :

"شیخ نے اردو کو تراش خراش کر ایسا درست کر دیا کہ اب اس کی لطافت اور صفائی فارسی سے کچھ کم نہیں معلوم ہوتی ـــــ لاریب زبان اردو شیخ کی کوششوں کی تمام تر ممنون ہے اگر جناب شیخ کو اصلاح زبان کی طرف توجہ نہ ہوتی تو زبان حال کی یہ صورت پیدا نہ ہوتی۔"

حسرت موہانی اصلاحات ناسخ کے متعلق خود اپنے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"ان کے (ناسخ) بعد ان کی زبان اس قدر مقبول عام ہوئی کہ متاخرین میں سے تقریباً ہر شاعر نے اسی کو اختیار کیا۔ مرزا داغ ہی کو دیکھ لیجیے انداز بیان اور بعض

محاورے جدار کھتے ہیں باقی زبان ناسخ ہی کی ہے" (بحوالہ بالا)

ان اقتباسات کو اگر بڑھایا جائے تو پوری کتاب تیار ہو سکتی ہے ان کے ایک شاگرد کلب حسین نادر نے ان کے اصلاحات پر مبنی ایک تصنیف تلخیص معلیٰ تیار کر ڈالی ہے اور لکھا کہ:

"ناسخ علیہ الرحمہ نے بیاوری طبع وقّاد ..... اپنے عہد میں ... ان سب لغویات اور حشویات کو دور کر کے ایسی صحت اور صفائی بندش اور شستگی زبان اور روزمرّہ کی پیدا کی کہ سخنوران پایۂ بلند اور دقیقہ رسانِ ہنرمند نے بدل پسند کیا... سب نے وہی طور اختیار کیا اور ہر ایک کو اس کی پیروی اور تقلید ملحوظ رہی"

ان تمام آرار سے اور ان خیالات سے کہ جن کا ذکر جستہ جستہ اس مطالعہ میں ہو چکا ہے اصلاحات ناسخ کی ہندستان گیر اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے یہ اصلاحیں برمحل تھیں مگر نہ حرف آخر تھیں اور نہ ایسا ہے کہ اب آئندہ کبھی اصلاح کی ضرورت نہ رہے گی۔

ناسخ کی اصلاحوں کی کامیابی اور گیرائی کا راز اس میں مضمر ہے کہ انھوں نے زبان کے سلسلہ میں ایک روشن شعور اور پاکیزہ ذوق کی ترویج کی اور محض شعر کے لیے نہیں بلکہ اچھی اور شستہ زبان کے لیے سماج میں عام گفتگو اور بول چال میں بھی ایک طرح کی زود حسی پیدا کی انھوں نے صرف شعر کی نہیں بلکہ شہر لکھنؤ کی زبان بھی بدل ڈالی اسی لیے رجب علی بیگ سرور نے "فسانہ عجائب" میں لکھا ہے ؎

بلبل شیراز کو ہے رشک ناسخ کا سرور
اصفہان اس نے کیے ہیں کوچہائے لکھنؤ

باب سیوم

(۱)

ناسخ کا مطالعہ کرتے وقت لکھنؤ کے اس پورے ماحول کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے جو ایک خاص انداز اور مزاج کا مالک تھا اور اس نے بکثرت ایسے فنکاروں کو پیدا کیا جو اس کے انداز و مزاج کی بھرپور ترجمانی کر سکیں ناسخ نہ صرف اس ماحول کے پروردہ تھے بلکہ اپنی ذاتی افتاد اور تربیت و ریاضت کے ذریعہ ڈھالے ہوئے مزاج اور طرزِ فکر کی بنا پر اس ماحول سے خصوصی اور طبعی مناسبت بھی رکھتے تھے ان کی طبیعت اور ان کے ماحول کے درمیان مثالی موافقت موجود تھی اس لیے ماحول نے ان کو بنایا بھی اور پھر اپنی ماہرانہ صلاحیتوں کی بنا پر انھوں نے خود ماحول سازی بھی کی اس طرح اس ماحول کے اوصاف و صفات کا جائزہ ناسخ کا جائزہ بن جاتا ہے اور ناسخ کی کارکردگی کا جائزہ خود اس ماحول اور اس عہد کی فطرت، عزائم اور نفسیات کا جائزہ بن جاتا ہے یہ عہد حقیقۃً ہیئت اور فارم اور اس کے متعلقات کے فروغ کا عہد تھا اور یہی بات ناسخ کے سلسلہ میں بھی مطالعہ کا فطری نقطۂ آغاز ہے۔

فنی نقطۂ نظر سے ناسخ کا مطالعہ ہیئت کے مسائل تک محدود ہے۔ ان کی شاعری میں زندگی کا کوئی ایسا اچھوتا شعور نہیں ملتا ہے جس سے کسی نظریہ کی بنیاد قایم ہو سکے۔ ان کے یہاں عام طور سے وہ جذباتی گہرائی بھی نہیں ملتی ہے جو اکثر شاعرانہ حقیقت نگاری کی

بنیاد بن جاتی ہے۔ وہ اصل میں تخیل کے شاعر ہیں اسی لیے ٹکنیک اور زبان کا بے شکن استعمال ان کے فن کے اصلی جواہر ہیں اگر حقیقت پر نظر ڈالی جائے تو معمولی عناصر کو چھوڑ کر شاعری کے سلسلہ میں تین ہی چیزوں کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ نظریہ، جذبہ اور تخئیل جو ٹکنیک کی مدد سے ایک خاص ہیئت میں ڈھلتی ہے یا فنکار کی کوشش سے ڈھالی جاتی ہے۔ فنکار نظریۂ زندگی کے مختلف ذاتی تجربات یا ان تجربات سے حاصل کرتا ہے جو اس کے اسلاف سے اس تک تہذیبی اور تاریخی میراث کے طور پر پہنچتے ہیں زندگی کا مطالعہ جتنے وسیع پیمانہ پر یا جتنے صحیح زاویہ سے کیا جائے گا، اور تجربات میں زر خیز اور فرسودہ کے درمیان فنکار کی قوت تمیز جتنے اچھے عنوان سے عمل پیرا ہوگی۔ اسی قدر صحت مند نظریہ کی تشکیل ہوگی۔ فن کی پیدائش کی طرف اگلا قدم جذباتی توانائی کی مدد سے فنکار اٹھاتا ہے۔ نظریہ اور جذبہ کے لیے فن کی آخری منزل تک پہنچنے کے لیے کوئی چینل چاہیے۔ تخیل ایسا ہی ایک چینل یا نکاسی کا راستہ ہے جس کے بعد ٹکنیک، الفاظ، ہیئت اور اسلوب وغیرہ کا موثر عمل شعر یا فن کو آخری شکل دے دیتا ہے اور پھر جمالیاتی کرشمے اگر سارا عمل موزوں طرح انجام پایا ہے تو دامن دل کھینچنے لگتے ہیں۔

اس سارے عمل پر اگر دھیان دیا جائے تو ناسخ، ہیئت و اسلوب کے شاعر ہیں ان کے پاس زندگی کا کوئی انفرادی نظریہ نہیں ہے جذبات بھی ان کے یہاں کم ہیں وہ غزل گوئی کرتے ہیں لیکن عشق ان کے یہاں ایک ایسی آگ ہے جو تخیل کو روشن تو کر سکتی ہے مگر جذبہ کو سیال و رواں نہیں بنا سکتی ان کا تخیل بے شک بلند پرواز ہے، الفاظ کا انتخاب اور ان کا دروبست بھی ماہرانہ ہے جس سے مجموعی طور پر ایک پرشکوہ طرز نمودار ہو جاتا ہے مگر یہ سارا عمل موضوع سے نہیں بلکہ ہیئت اور اس کے مسائل سے متعلق ہے۔

ناسخ اصلاً جذبہ کے نہیں بلکہ خیال کے شاعر ہیں اسی لیے ان کے یہاں ابلاغ کے آداب و لوازم وہی ہیں جن کی خیال کی شاعری میں ضرورت پڑتی ہے۔ جذبہ اور خیال کے ابلاغ میں

فرق دنیا کے ہر ادب میں دکھائی دیتا ہے۔ جذبہ اپنی فطرت کے اعتبار سے پیچیدہ چیز نہیں ہے۔ پیچ و تاب سے عاری، الجھاؤ گھماؤ پھراؤ سے آزاد ایک لہر ہے جس کو نہ کسی مصنوعی تدبیر سے پیدا کیا جاسکتا ہے اور نہ پیدا ہونے سے باز رکھا جاسکتا ہے، ایک ایسی آگ جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے۔ جذبہ گہرا ہوسکتا ہے شدید ہوسکتا ہے مگر پیچیدہ نہیں ہوتا ہے اور نہ یہ صفت کبھی جذبہ کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ جذبہ میں پیچیدگیوں کا گمان اس وقت ہوتا ہے جب اس میں غیر جذباتی عناصر داخل کر دیے جاتے ہیں۔ سچا جذبہ سادے اور معنی خیز الفاظ میں آسانی سے ظاہر ہوسکتا ہے۔ سننے والے کا ذہن بھی اس کو بغیر کسی منطقی یا سائنسی ثبوت کے قبول کرلیتا ہے اسی لیے جذبہ کا ابلاغ مرصع کاریوں کے پیچ و تاب سے خالی ہوتا ہے خیال کی نوعیت اس سے مختلف ہے وہ جتنا بلند ہوگا یا پھیلے گا اسی قدر پیچیدہ ہوتا جائے گا اور اسی تناسب سے صنایع لفظی اور معنوی کے سہاروں کا محتاج بنتا جائے گا۔ تخیل میں چونکہ جذبہ کی طرح کوئی اشتمالی صداقت نہیں ہوتی ہے اس لیے اسے بیرونی استدلال یا سفسطہ سے صحیح ثابت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کسی بھی جذبہ میں کیوں کا سوال نہیں پیدا ہوتا لیکن خیال میں کیوں اور کیسے کی طرف ذہن ضرور منتقل ہوتا ہے اسی لیے ایک فنکار کو خیال مع شاعرانہ ثبوت اور استدلال کے سننے والے تک پہنچانا ہوتا ہے۔ جذبہ محض جذبہ ہونے کی وجہ سے قابل قبول ہو جاتا ہے خیال محض خیال ہونے کی وجہ سے قبولیت کے لائق نہیں بنتا بلکہ اسے باور کرانا پڑتا ہے۔ کسی بھی مجموعی تصوّر میں ابلاغ کی نوعیت جذبہ اور خیال کی آمیزش کے تناسب کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ جذبہ اور خیال کے ابلاغ میں جو دوری ہے اسے میرؔ اور ناسخؔ کے اسلوب کو سامنے رکھ کر آسانی سے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ غالبؔ اس مقصد کے لیے شاید اچھی مثال ثابت نہ ہوں اس لیے کہ ان کی شاعری کے خام مواد میں جذبہ اور خیال کے تناسب میں زیادہ فرق نہیں ہے۔

جذبہ اور خیال کے جس فرق کو ظاہر کرنا ہے وہ خود ناسخؔ ہی کے یہاں ابلاغ کی مختلف بلکہ متضاد نوعیتوں کے مطالعہ سے ممکن ہے ناسخؔ کا ایک غیر مشہور شعر ہے۔

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں
ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں

بلاشبہ یہ شعر جذبہ سے معمور ہے۔ لہجہ کے اعتبار سے بھی اور معنی کے حساب سے بھی اس میں خیال کی صنعت گری موجود نہیں ہے اس شعر کو اردو کے بہترین اشعار میں شمار کرنا ممکن ہے اس کی مخصوص کیفیت اور مجموعی تاثیر کو الفاظ میں ظاہر کرنا آسان کام نہیں ہے چونکہ شعر کی بنیاد جذبہ پر ہے اس لیے تشبیہ و استعارہ اور دیگر صنایع و بدایع سے بے نیاز ہے، نہ شعر میں کوئی پیچیدہ ترکیب ہے نہ ثقیل لفظ ہے اور نہ کسی طرح کا ثبوت موجود ہے جذبہ اپنی صداقت ذاتی کی خود ہی تفسیر بن گیا ہے۔ اس کے برخلاف تخیل سے بوجھل معنی کا ابلاغ سمجھنے کے لیے خود ناسخ ہی کے بہت سے بلکہ زیادہ تر اشعار موجود ہیں جنھیں بغیر کسی جستجو کے ان کے دیوان کے کسی بھی صفحہ سے منتخب کیا جا سکتا ہے۔ ان کے دیوان اول کی پہلی ہی غزل کا شعر ہے ؎

چمکنا برق کا لازم پڑا ہے ابر باراں میں
تصوّر چاہیے رونے میں اس کے روئے خنداں کا

رونے کو بارش سے تشبیہ دینا پرانا مضمون ہے۔ ناسخ کا ذہن چونکہ خیال آفریں ہے اس لیے وہ پرانی تشبیہ میں نئے گوشے تلاش کر کے ایک نامکمل مضمون کو مکمل یا ایک پرانے مضمون میں جدّت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ابر باران سے برق کی طرف خیال کا منتقل ہونا فطری عمل ارتباط ہے۔ برق تک پہنچ کر روئے خنداں کا تلاش کر لینا ناسخ کے ایسے خیال باف اور خیال مند شاعر کے لیے دشوار نہیں ہے اگر پورے شعر پر نظر ڈالی جائے تو خیال کی منطقیانہ تدریج مع ثبوت کے سامنے آجاتی ہے۔ اسی طرح ناسخ کا ایک اور شعر ہے جو خیال آفرینی اور ابلاغ کے کرتب کا اس سے بھی زیادہ قایل کر دینے والا نمونہ ہے۔

موئے آتش دیدہ بنتا ہے مرا تار نگاہ
ایسے اس آتش کے پرکالے کے ہیں رخسار گرم

آتش اور گرمی کے ذکر کے باوجود شعر میں جذبہ کی حرارت موجود نہیں ہے ایک ایسا طلسماتی ماحول ہے جس میں فنکارانہ کاوش کے ذریعہ ایک غیر فطری خیال کو شاعرانہ استدلال سے ذہن نشین یا زبردستی باور کرانے کی کوشش ملتی ہے۔ یہ دونوں شعر اس مخصوص تخلیقی نوعیت اور خیال آفرینی کی نمائندگی کرتے ہیں جس کی چھاپ ناسخ کی زیادہ تر شاعری پر لگی ہوئی ہے اس طرح کے اشعار اس سانچے اور ذہن کی اس اندرونی ساخت کو واضح کرتے ہیں جس میں ناسخ کے فن کو ڈھلنے کا موقع ملتا ہے اس طرح ناسخ کی شاعری کے تعمیری مراحل کچھ اس طرح بنتے ہیں۔ بنیادی خیال۔ تشبیہ استعارہ اور کنایے کی مدد سے خیال کے مختلف مناسبات کی یکجائی۔ ترصیع اور زبان کی نوک پلک درست کرنا اور پھر سارے مناسبات کو مصنوعی دلیل و ثبوت سے شاعرانہ طور پر مربوط کر دینا۔

خیال بندی اور خیال آفرینی کے چند مخصوص اسالیب ہیں زیادہ تر شاعر انھیں سے کام لیتا ہے۔ مرکب تشبیہات، استعارہ بالکنایہ، مجازات کی مختلف قسمیں، مبالغہ حسن تعلیل، تمثیل اور کبھی کبھی ڈرامائی کیفیت کا پیدا کرنا۔ یہ تمام اسالیب اگر کسی بلند مقصد یا اہم جذبہ کے لیے ہیئتی ذریعہ بنتے ہیں تو ان کی زندگی اور برقرار رہنے والی ندرت بڑھ جاتی ہے اور یہ اسالیب ایک زندہ فارم کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں برخلاف اس کے اگر یہ اسالیب خود اپنا ہی مقصود بن جاتے ہیں تو تھوڑی دیر کے لیے چکا چوند پیدا کر کے پتھریلے جسم کی طرح بغیر روح کے پڑے رہتے ہیں۔ ناسخ نے زیادہ تر انھیں اسالیب سے کام لیا ہے اسی لیے ان کے بیشتر اشعار حرارت اور زندگی سے خالی پتھریلے مگر خوبصورت اجسام کی کیفیت رکھتے ہیں۔ جذبہ کا شاعر بھی خیال سے گریز نہیں کر سکتا ہے مگر اس کی خیالی دنیا "محشرستان خیال" ہوتی ہے۔ ناسخ کی دنیا نگارستان خیال ہے۔

ایسی آباد خیالی دنیا اردو کے بہت کم شاعروں کے حصّہ میں آئی ہے ؎

دور ہے یار اپنی نظروں سے تصور میں قریب
گھر تو ویران ہے مگر بزم خیال آباد ہے

گھر کی یہ ویرانی جذبہ کی کمی کی وجہ سے ہے۔ بزم خیال یقیناً بہت آباد ہے مگر نہایت نامانوس قسم کے مخلوقات سے جن میں انسانی تہذیب کا تنفس اور بشری دل کی حرکت زیادہ محسوس نہیں ہوتی ہے۔

(۲)

شاعری کا یہ انداز و بنیاد جس میں خیال اور تخیل کو اہمیت حاصل ہو مختلف صنایع و بدایع کے استعمال کے بغیر پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا ناسخ کے یہاں بھی صنعتوں کا استعمال اعتدال کے حدود سے گزر کر اکثر ذریعہ کے بجائے خود مقصود بن جاتا ہے۔ یہاں ان کی تمام استعمال کردہ صنعتوں کا بیان کرنا نہ ممکن ہے اور نہ ضروری صرف چند صنعتوں کے ذکر پر اکتفا کرنا ہے۔

ناسخ کی استعمال کردہ صنعتوں میں تمثیل نگاری کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ واضح رہنا چاہیے کہ تمثیل نگاری اپنی جگہ پر نہ کوئی عیب ہے اور نہ بُرا رجحان تمثیل کے استعمال سے فارسی یا اردو کا کوئی بھی شاعر مستثنا نہیں ہے فارسی میں بے دل ناصر علی اور شوکت ان ہندستانی فارسی گو شعرا میں محسوب ہوتے ہیں جن کے یہاں تمثیل نگاری افراط سے موجود ہے اور اس کا اثر قدیم شعرائے اردو پر بھی بہت پڑا ہے فارسی نژاد شاعروں میں صائب کو تمثیل نگاری کا بادشاہ سمجھا جاتا ہے صائب کی تمثیل نگاری نے اردو کے تقریباً ان تمام شعرا کو جو اس طرح کا رجحان رکھتے تھے کسی بھی دوسرے تمثیل نگار کے مقابلہ میں زیادہ متاثر کیا ہے۔ ناسخ بھی صائب سے زیادہ اور دوسرے

تمثیل نگار شعرا سے کمتر متاثر تھے۔

جس شبستاں میں ہو صائبؔ کلک ناسخؔ شعلہ ریز
چاک سازد جامۂ فانوس را بر تن چراغ

ایک غیر مادّی مضمون کے لیے مادّی مثال کا تلاش کرنا تمثیل نگاری کی اصل بنیاد ہے مگر کامیاب اور موثر مثال کے لیے بہت سی دوسری صنعتوں کا استعمال بھی اکثر ضروری ہو جاتا ہے تاکہ مثال اور مدعا کے درمیان جو نامانوس اجنبیت یا دوری موجود ہو وہ برطرف ہو سکے اور مصنوعی منطقی ربط کے ذریعہ سے خلا کو پُر کر لیا جائے ایسے میں صنعت مراعات النظیر بہت کام آتی ہے مگر اس راہ پر چلنے میں اکثر ایسا کثیف غبار اڑانا پڑتا ہے کہ جس کی وجہ سے جذبہ اور دل کی طرف جانے والی راہ تاریک ہو جاتی ہے یہ بات صائبؔ کے یہاں بھی نظر آتی ہے اور اسی لیے صائبؔ کو فارسی شاعری میں ایک بڑے شاعر سے زیادہ ایک بڑے استاد اور صنعت گر کی حیثیت حاصل ہوئی۔ اسباب چونکہ مشترک تھے اس لیے ناسخؔ کا انجام بھی یہی ہوا وہ بڑے شاعر کم اور بڑے صنعت گر استاد اور زبان داں زیادہ تسلیم کیے گئے۔

اس عام رجحان کے درمیان یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ تمثیل نگاری کے اچھے اور شائستہ نمونوں سے ناسخؔ کا کلام خالی ہے اردو شاعری کی تقریباً ڈھائی سو سالہ تاریخ میں کوئی ایسا شاعر پیدا نہیں ہوا جو تمثیل نگاری کے فن میں ناسخؔ پر فوقیت رکھتا ہو۔ ناسخؔ کے سب ہی قدیم نقاد تمثیل نگاری میں ان کے کمال پر متفق ہیں۔ کوئی بھی دوسرا شاعر اس معاملہ میں ان کے ذہن کی زرخیزی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس سلسلہ میں وہ سب سے زیادہ کامیاب اخلاقی مضامین کی تمثیل میں دکھائی دیتے ہیں یہ دونوں باتیں اس عہد کے میلان و رجحان سے بھی کافی مطابقت رکھتی تھیں اسی لیے ناسخؔ کو ایک بڑا مرتبہ عطا کرنے میں ان کی غزلوں کے اخلاقی مضامین اور ان کے لیے نہایت مناسب مثالوں کی

جستجو کا بھی بہت دخل ہے۔ یہاں ان کے چند ایسے اشعار جنھیں تمثیل نگاری کا اچھا نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے درج کیے جاتے ہیں۔

چھوڑ کر اپنی تعلّی، کر تواضع اختیار — رتبہ مسجد کے منارے کا ہے کم محراب سے
بے ثباتی ہے نہایت حسن بے ناموس کو — پائیداری ہوتی ہے کب شمع بے فانوس کو
جتنے ہیں صاحب سخن ان کی طبیعت نرم ہے — ہے دلیل اس پر زبان میں استخواں ہوتا نہیں
مرتبہ کم حرص رفعت سے ہمارا ہو گیا — آفتاب ایسا ہوا اونچا کہ تارا ہو گیا

جو دل ہی ٹوٹ گیا کیا ہو شعر تر پیدا
ہوئے ہیں شاخ شکستہ سے کب ثمر پیدا

تمثیل کے بعد دوسرا عنصر مبالغہ آرائی ہے جس سے ناسخ کا کلام و دیوان بھرا پڑا ہے مبالغہ بھی ایک ایسا عنصر ہے جسے شاعری سے جدا کرنا ممکن نہیں ہے وہ شاعری کے در حقیقت ایسے قوی حربوں میں ہے جس سے حقیقت نگاری کو نفوذ، کاری وار لگانے اور سامع میں یقین و وثوق پیدا کرنے کا موقع ملتا ہے۔ لیکن بات اسی وقت بنتی ہے کہ جب دائرہ اعتدال سے خارج نہ ہو جس عہد میں ناسخ اور اردو کے دوسرے بڑے شعراء پیدا ہوئے وہ ملوکیت اور جاگیرداری کا عہد تھا ان میں قصیدوں کے لکھنے کا رواج بہت تھا جس میں مبالغہ آرائی کو حد سے آگے پہنچانا بہت بڑا ہنر سمجھا جاتا تھا۔ قصیدہ میں مبالغہ آرائی ایک ایسی عادت بن چکی تھی کہ دوسرے اصناف میں اور بالخصوص غزل میں کہ جس کا رواج بہت زیادہ تھا مبالغہ آرائی سے گریز کرنا ناممکن سا بن گیا تھا اسی لیے اردو کا کوئی بڑے سے بڑا اور غزل کے آداب و حدود سے اچھی واقفیت رکھنے والا شاعر بھی غیر فطری مبالغہ آرائی سے کم تر ہی بچ سکا ہے۔ ناسخ نے قصیدہ نگاری کے میدان میں کوئی خاص پیش رفت نہیں کی مگر اس سے مناسبت رکھنے والا مزاج اور لیاقت تو ضرور رکھتے تھے ان کے یہاں مبالغہ آرائی کا وہ رجحان جو بعض اسباب کی وجہ سے دیگر اور بہت سے رجحانات کی طرح قصیدوں میں اپنا جوہر و مصرف نہ دکھا سکا اس نے غزلوں میں

اپنی تشفی کے سارے سامان پیدا کر لیے اگرچہ اس سے غزل کی فطرت خاصی حد تک مجروح ہوئی۔ جس عہد میں ناسخ اپنی شاعری میں مبالغہ آرائی سے کام لے رہے تھے ایک تو اس میں مبالغہ عام طور پر پسند کیا جاتا تھا پھر اس عہد کے ادبی ذوق رکھنے والے عربی اور فارسی شاعری کے اثر سے مبالغہ سے بڑی حد تک مانوس ہی نہ تھے بلکہ محظوظ بھی ہوتے تھے۔ حسب ذیل اشعار مثال کے طور پر مبالغہ پر مبنی اسی خیال آفرینی کی نمائندگی کرتے ہیں جسے ناسخ کی انفرادیت نہیں بلکہ اس عہد کی اجتماعی خصوصیت اور عام رجحان کہا جا سکتا ہے۔

آتش رنگ حنا سے مچھلیاں جلنے لگیں آپ نے دھوئے جو دریا کے کنارے ہاتھ پاؤں

آتشیں چہرے سے ہر شاہد مضمون ناسخ کیا عجب گر مرے اشعار کا دفتر جل جائے

لاغر ہیں ہم ایسے کہ نگل جائے جو چونٹی
اٹکے نہ ہمارا بدن زار گلے میں

کبھی کبھی صنایع کے مختلف اقسام کا فطری استعمال کلام میں ندرت اور تاثیر پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے مگر جب کسی شاعر کو عادت سی پڑ جاتی ہے تو نتیجہ عام طور سے اچھا نہیں نکلتا۔ کلام میں آورد پیدا ہو جاتی ہے۔ فکر لدھڑ ہو جاتی ہے صناعی سے اگرچہ مضمون تازہ کے انبار لگ جاتے ہیں مگر خون جگر کی سرخی و گرمی جاتی رہتی ہے۔ نیا مضمون بجلی کے ایک کوندے کی طرح چمکا چوند پیدا کر کے گزر جاتا ہے لیکن دل و دماغ میں پیوست ہو کر شخصیت کا سرمایۂ محفوظ نہیں بننے پاتا۔ ناسخ کی صناعی بھی کچھ ایسی ہی صورت رکھتی ہے۔ ان کی خلاّق و صنّاع طبیعت مضمون آفرینی سے کبھی نہیں تھکتی مگر ان کے مخلوقات و مصنوعات ایک مرتبہ اثر و روشنی پیدا کر کے مضمحل ہو جاتے ہیں غزل کے اچھے اشعار کی مستند صفت یہ ہے کہ انھیں بار بار پڑھا جا سکتا ہے اور دائمی تاثیر کی وجہ سے ان سے بار بار مختلف مواقع پر حظ اٹھایا جا سکتا ہے ناسخ کے یہاں صناعی کی وجہ سے زیادہ تر حال برعکس دکھائی دیتا ہے، اکثر ان کے اچھوتے تخیل پر صناعی کی بہار دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے

مگر ایک ہی بھرپور ان کی ساری خوبیوں کا جائزہ لینے کے لیے کافی ہوتی ہے دوسری نظر کا جواز بہت کم رہ جاتا ہے بلکہ ممکن کہ ہے دوسری نظر عیوب کو سامنے لائے اور قند مکرّر کے بجائے بدمزگی پیدا کر دے۔

جانتے ہیں جس کو سب تار نفس — تو سن عمر رواں کی باگ ہے
آب و گل میں اڑ گیا ہے تو سن عمر رواں — توڑ کر تار نفس کو تازیانہ کیجیے
کھلے نہیں دہن تنگ سے ہنسی ہیں دانت — چمک ہے جگنوؤں کی آشیانِ عنقا میں
گزرتا ہوں اگر بازار سے میں جوش سودا میں — رواں ہر سنگ ہوتا ہے مری جانب ترازو سے

معنی ثمر، حروف ورق، صنعتیں ہیں گل
ناسخ ہے کلک فکر نہال سخن کی شاخ

اس طرح کے اشعار ناسخ کے کلیات میں بہت ہیں جو خیال پر حاکمانہ تصرّف کا اظہار تو کرتے ہیں مگر فن غزل اور اس کے اصلی مزاج سے کس قدر ہم آہنگ ہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ لفظی مناسبتوں کے ابنار لگا کر اشعار کے ڈھیر لگا دیتے ہیں مگر اس طرح کے اشعار میں خالص زبان کے شائقین کے لیے تو کچھ لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن معنی پسند ذہنوں کو زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی۔

دن سیہ رات سیہ ماہ سیہ سال سیہ — دل سیہ بخت سیہ نامۂ اعمال سیہ
ایک میں اور ہیں یہ چار بلائیں کالی — خط سیہ زلف سیہ چشم سیہ خال سیہ

کر دیا اس گل کے پرتو نے جو دریا کو چمن
بلبلوں سے صاف آتی ہے صدائے عندلیب

صناعی کی اسی کوشش میں ان کی خیال آفرینی جب کسی صورتِ حال یا واقعہ کے لیے کوئی اچھی توجیہ و تعلیل دریافت کر لیتی ہے یا کوئی ایسی تمثیل تلاش کر لیتی ہے جو ثبوت و دلیل کا کام انجام دینے کے علاوہ سماجی بنیاد یا فطرت سے کوئی ربط یا عام تجربات

سے کوئی خاص وابستگی رکھتی ہے تو ان کی فنکارانہ مہارت کا خوش گوار نمونہ بھی بن جاتی ہے۔

کسی کا کب کوئی روز سیہ میں ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے

پیر جا پہنچے عدم کو رہ گئے پیچھے جوان
ہیں کمانیں راہ چلنے میں زیادہ تیر تیز سے

سب زخم مرے جلتے ہیں شعلے کی طرح سے
بجلی کی طرح ہے تری تلوار میں گرمی

شامل نہ ہو جو ناسخ برگشتہ کا غبار
صحرا میں گرد باد سے چکّر نہ ہو سکے

ناسخ کی فنکارانہ خیال آفرینی کی اور اچھی مثالیں، ان مواقع پر دکھائی دیتی ہیں جہاں وہ کسی صورت حال کو ڈرامائی موڑ دینے میں کامیابی حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کی خیال آفرینی کا شاید سب سے زیادہ گوارا پہلو اسی طرح کے اشعار کی مدد سے سامنے آتا ہے اسی قبیل کے اشعار میں وہ شعر بھی شامل ہیں جن میں وہ خیال کی معمولی رفتار کو اچانک ایک ایسا موڑ دیتے ہیں جس سے نہ صرف خیال چمک اٹھتا ہے بلکہ سننے والا بھی تحیّر کے ایک نئے اور خوشگوار تجربہ سے دوچار ہوتا ہے ایسے اشعار کی ساری اہمیت ان کی ڈرامائی یا نیم ڈرامائی کیفیت و تحریک میں مضمر ہوتی ہے۔

ہم خواب میں واں پہنچے تدبیر اسے کہتے ہیں
وہ نیند سے چونک اٹھے تقدیر اسے کہتے ہیں

وہ مجھ سے گریزاں تھا کل اس کو میں گھر اپنے
باتوں میں لگا لایا تقریر اسے کہتے ہیں

محفل سے اٹھانے کا جب قصد کیا اس نے
دانستہ میں غش لایا تزویر اسے کہتے ہیں

کاوشیں اب تک چلی جاتی ہیں گو میں مر گیا
جائے گل کانٹے مری تربت پہ ظالم دھر گیا

ناسخ کی شاعری اور صنعت گری کے متعلق یہ خیالات ایک طرف تو ان کے اشعار سے حاصل شدہ تاثر کا براہ راست نتیجہ ہیں اور دوسری طرف وہ اشعار بھی کسی قدر

مدد پہنچاتے ہیں جنھیں ان کے اعترافات کا مرتبہ دینا چاہیے۔ ہر شاعر کی طرح ناسخ بھی کبھی کبھی ان تخلیقی ارتعاشات اور ذہنی کارکردگی کا ذکر کرتے ہیں جو شعر گوئی کی بنیادی تحریک یا فنکاری کے سلسلہ میں ان دخیل کیفیتوں کا اظہار کرتے ہیں جن سے انھیں گزرنا پڑتا ہے یہ اشعار ناسخ کی فنکارانہ جدوجہد کے سلسلہ میں اس لیے بھی معتبر ہیں کہ ان کا واضح اثر ان کی مجموعی شاعری پر صاف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ان سے نہ صرف ناسخ کے ذہن بلکہ ان کے اسلوب کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

جی لڑا دیتا ہے کیسی ہی زمین ہو سنگلاخ
خامہ تیشہ ہے تو ناسخ کوہ کن سے کم نہیں

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ناسخ کا اسلوب ان کی جی لڑ دینے والی ہمت اور جان توڑ محنت کی تصدیق کرتا ہے ان کا خامہ بیشک ایک تیشہ ہے جس سے وہ کوہ کنی کا کام لیتے ہیں ان کے پاس 'کوہ کن' کی ہمت موجود ہے مگر وہ جذبہ نہیں ہے جس سے یہ مثالی اور اساطیری کوہ کن سرشار تھا اسی لیے ان کے تراشے ہوئے پہاڑ خوشنما اور ٹھوس اصنام کی شکل تو ضرور اختیار کر لیتے ہیں لیکن زندگی کے آثار سے خالی رہتے ہیں وہ ہر چیز کی تخلیق کر سکتے ہیں لیکن اپنے مخلوقات کو عام طور سے دل نہیں عطا کر سکتے۔ ناسخ کے اسی طرح کے دوسرے اشعار بھی اسی نقطہ نظر کی تصدیق کرتے ہیں ؎

صنعت ترصیع گر دیکھو مرے اشعار کی
پھر پسند آئے نہ صناعی مرصّع کار کی

ہر بیت میں اک شاہد معنی کی ہے تصویر
ناسخ ہے مرقع، نہیں دیوان ہمارا

ہوں سوار تو سن معنی زمین شعر میں
صید مضمون جو ہے ناسخ بستۂ فتراک ہے

اب قافیہ بدل کے دلا فکر کیجئے
اشعار اس غزل میں ہیں مہمل بھرے ہوئے

ہمارے حکم سے یہ تخم ریزی ہے مضامین کی
کہ ناسخ ہر زمین شعر پر اپنا اجارہ ہے

کر لیا پریوں کو تسخیر سنا کر اشعار
مثل ناسخ نہیں اب صاحب افسوں پیدا

ناسخ کے جن اشعار کو اس موقع پر منتخب کر کے مندرج کیا گیا ہے وہ ان کے فنی خصائل کے بیشتر پہلو پر حاوی ہیں۔ ان کی نارک خیالی صنعت ترصیع کی طرف خاص میلان، افسوں گری، قافیہ اور بحر کے سہارے سے خیال پیمائی پھر تخم ریزی اور صید مضمون کے استعارے اس متنوع صناعی اور آورد کی طرف خصوصی اشارے کرتے ہیں جو ناسخ کا سرمایہ بلاغت ہے ان کا یہ خیال بھی غلط نہیں ہے۔

اے کلک فکر ایسی غزل اس زمین لکھ — چھانٹا نہ جائے شعر کوئی انتخاب میں
میرے اشعار ایسے ہیں چیدہ — کہ نہیں دخل یاں سخن چین کا

شعر تر جو ہے مرا اک گل تر ہے ناسخ
نہیں قرطاس یہ دامن ہے کسی گل چیں کا

مگر شرط یہ ہے کہ ہم انتخاب اور سخن چینی کا معیار زبان و بیان کی صحت، محاورات اور روزمرّہ کی درستی اور صنایع و بدایع کے مستند اسالیب تک محدود رکھیں اور زندگی کی اس ہلچل، ماحول کی اس شکست و ریخت اور معرکہ بیم و رجا کے اس ہیجان اور خون جگر کی اس لالہ کاری کو نظر انداز کر دیں جس سے فنکاری میں تیسرا بُعد پیدا ہوتا ہے۔ ناسخ کی خیالی دنیا کی ہمہ گیری میں شبہ نہیں مگر ان کا المیہ یہ ہے کہ وہ اپنے دام خیال میں الجھ کر رہ گئے۔ خیال بذات خود کوئی بری چیز نہیں ہے بشرطیکہ وہ کسی حقیقت کی طرف راہ نمائی کرے مگر ناسخ کے یہاں حقیقتیں خیال کی تابع بن جاتی ہیں جس کی وجہ سے طلسماتی تصویریں تو ابھرنے لگتی ہیں مگر زندگی کی صداقتیں جو بالآخر فن کی جان بنتی ہیں دفن ہو کر رہ جاتی ہیں۔

جو شاعر بھی صداقتوں اور حقیقتوں کا صحت مند ادراک رکھتا ہے وہ خیال آفرینی کے ذریعہ ان میں ربط تنظیم اور جمالیاتی آہنگ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ تشبیہ استعارہ اور علامت وغیرہ کو درمیان میں لا کر مختلف حقیقتوں کو جوڑنے اور ان میں روابط کے

تہ در تہ سلسلہ کو دریافت بلکہ پیدا کرنے کی سعی کرتا ہے اس سلسلہ میں ضروری ہے کہ فنکار حقیقت اور استعارہ کے درمیان فرق کو اچھی طرح محسوس کرتا ہو۔ انحراف وہیں سے پیدا ہوتا ہے جہاں سے استعارہ کو حقیقت اور حقیقت کو استعارہ سمجھ لیا جائے ناسخ کے یہاں اکثر حقیقتیں استعارہ بن کر رہ جاتی ہیں اور اسی لیے ان کا فن اکثر حقیقت کی ٹھوس بنیاد پر مبنی ہونے کے بجائے ایک خیال آفریں استعارہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ ناسخ نے ایک جگہ کہا ہے ؎

یہ مضمون غم و شادی و مرگ و زیست ہے لاشئ
جہاں وہ بیت ہے جس میں سراسر استعارہ ہے

یہ شعر اگر کوئی صوفی کہتا تو اس کے پیش نظر حقیقت کا کوئی ماورائی تصور ہو سکتا تھا لیکن ناسخ یہ محسوس نہ کر سکے کہ یہی چیزیں کائناتی حقایق کی طرف راہ نمائی کرتی ہیں اور اگر جہاں حقیقت کے بجائے صرف استعارہ ہے تو ان کا فن استعارہ کا استعارہ بن کر حقیقت سے اور بھی دور ہو جائے گا۔ ناسخ کے خاص حریف آتش بھی شاعری کو مرصّع سازی سمجھتے ہیں ؎

شاعری بھی کام ہے آتش مرصّع ساز کا

لیکن ان کی مرصّع سازی کے پس پشت حقیقت کا ادراک بھی برسر عمل ہے وہ اپنی مرصّع سازی میں گرمی، روح اور جاگتا ہوا شعور و دل بھی رکھتے ہیں۔

(۳)

ناسخ کے یہاں زندگی کا اس قسم کا ادراک، تہذیب کا ایسا تصوّر اور اس کے مطابق فنکاری کا یہ خاص اسلوب، سماجی مزاج اور معاشرہ پر حاوی عام رویّہ سے بڑی حد تک مطابقت رکھتا تھا اگر ہم اٹھارویں اور انیسویں صدی کی زندگی کا ایک عام تصوّر اور بالخصوص شمالی ہندستان اور اودھ میں چھائے ہوئے زندگی کے عام میلانات، اعتقادات اور توہمات کو پیش نظر رکھیں. تو صرف ناسخ ہی کی حد تک نہیں بلکہ عام انسانی زندگی میں بھی خرافیات اور اساطیری عناصر کا دخل بہت دیکھیں گے جو بچّہ بھی ایسے سماج سے ابھرے گا خواہ وہ شاعر ہو یا نہ ہو کسی نہ کسی حد تک اپنے عہد پختگی میں بھی مافوق الفطرت قوتوں کا ضرور قیدی رہتا ہے اور بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے پختہ تعقّل کی وجہ سے ذہنی اور جذباتی اعتبار سے ایک مکمل طور پر آزاد وجود اور ہستی کی حیثیت سے اپنی انفرادی اور سماجی ضرورتوں کو پورا کرنے کا اہل بن سکے۔

ہر بچّہ کی طرح شاعر کا حیاتیاتی اور ذہنی نشوونما ایک غیر سماجی فرد سے رفتہ رفتہ ایک سنجیدہ، ذمہ دار اور تہذیب و معاشرہ کی حقیقتوں کو پہچاننے والے فرد کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ بچّے جو بالآخر سماج کی تشکیل کرتے ہیں، ابتدا میں ان کے احساس و عمل کی محرّک فقط جبلّتیں ہوتی ہیں وہ کچھ باشعور بھی ہو جاتا ہے تو اس کے سوچنے اور عمل کرنے کا ڈھنگ لاسماجی، ہوتا ہے اس کا تخیّل بنیادی طور پر عتیقی (Primitive) ہوتا ہے۔ تہذیب کی قدآور قوتوں سے اس کی کشمکش عرصہ دراز تک جاری رہتی ہے وہ اپنی جبلّتوں کے اشاروں پر چلنا چاہتا ہے اور سماج اسے مدنی الطبع اور مہذب بنانا چاہتا ہے عام طور سے سماجی اور تہذیبی قوتوں کی آخرکار فتح ہوتی ہے اور بچّہ جو شاعر بھی ہو سکتا ہے۔ مفاہمت

کر کے تہذیب کا زرّیں قلادہ اپنی گردن میں ڈال لیتا ہے مگر یہ بھی طے شدہ بات ہے کہ کوئی بھی بچّہ بظاہر سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہونے کے بعد بھی سو فیصدی سماجی نہیں بنتا اور نہ جبلّتی کردار اور عتیقی خرافات و تصورات سے مکمل طور پر چھٹکارا پاتا ہے۔ دوسرے افراد تو دائرہ اعتدال میں نسبتہً آسانی سے اور جلد آجاتے ہیں لیکن فنکار کے ذہن کا نفسیاتی اصطلاح کے مطابق معتدل ہونا ذرا مشکل ہی ہوتا ہے۔ اس طرح کے اثرات غیر ترقی یافتہ سماج اور شاعروں کو چھوڑیے سائنس دانوں میں بھی چھپے رہتے ہیں اور ان کی کارکردگی پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ نفسیاتی ضابطوں کے مطابق اگر فرد ہر طرح معتدل ہو جائے تو نہ اس کو شاعری کی ضرورت پڑے اور نہ کسی کو اس کی شاعری سے محظوظ ہونے کا شوق ہو۔ شاعر کے عہد ترقی اور تخلیقی عمل میں عتیقی فکر و اعتقاد اور شعور و تخیل کے بچے کھچے اجزاء بار بار کبھی اپنی اصلی شکل میں اور کبھی بھیس بدل کر نمودار ہوتے ہیں بلکہ نمودار ہوتے رہتے ہیں اور اگر کہیں سماج انھیں قبول کرنے کے لیے زیادہ آمادہ ہو، جیسا کہ عہد ناسخ میں تھا تو ایسے فنکار و خیالات کو خوب پھلنے پھولنے کا موقع بھی فراہم ہو جاتا ہے۔

عہد عتیق کے انسان کی سب سے بڑی خصوصیت اَن دیکھی اور مافوق الفطرت اور غیر انسانی قوتوں کا فکر و اندیشہ پر مستقل قبضہ ہے جو بالآخر خرافاتی عقاید کو جنم دیتے ہیں انھیں کی وجہ سے اکثر جادو ٹونا اور بہت سے سماجی توہمات اور نام نہاد مذہبی رسموں کا رواج ہوتا ہے۔ تہذیب و تمدن کے اثرات کے باوجود معاشرہ میں ان چیزوں کا پنہاں یا آشکار عمل چلتا رہتا ہے۔ اتفاق یہ ہے کہ ہندستان میں گزشتہ صدیوں میں کہ جب اردو شاعری اور ادب کا ارتقاء جاری تھا اس رجحان کو پھیلنے کے لیے زیادہ موافق حالات مل گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندستان کی دوسری زبانوں کے ادب کی طرح اردو میں بھی عتیقی تخیّل، خرافات اور مافوق الفطرت عناصر کا کافی دخل بڑھ گیا اور شاعروں سے کہیں زیادہ اس طرز فکر کا اثر اردو کے نثر نگاروں میں دکھائی دینے لگا اس لیے کہ شاعروں کو بالعموم

اپنے ذاتی بت تراش لینے کی سہولت رہی ہے۔ نثر نگاروں کو سماج کے تراشے ہوئے بتوں کو بالخصوص داستانوں میں استعمال کرنا پڑتا تھا اسی طرح کے ماحول اور سماج میں ناسخ کی بھی پرورش ہوئی تھی اس لیے اس بات پر تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ ناسخ کے تخیل و تفکر میں عتیقی آثار، مشاہدہ اور خیال بندی کی جھلکیاں افراط سے دکھائی دیتی ہیں۔ ان کا ذہن مافوق الفطرت چیزوں کو قبول کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا تھا وہ ایسی تہذیب کے پروردہ تھے جو شاندار ہونے کے باوجود قرون ماضیہ کے توہمات سے باہر نہیں نکلی تھی انھیں حقیقتہً سماج کی طرف سے ملتی تھی اس لیے عمر بڑھنے کے بعد بھی توہمات کی خلاّقی اور اس کے کرداروں کی پسندیدگی سے انھیں چھٹکارا نہیں مل سکا وہ ہر طرح کی تربیت اور تعقّل کی صیقل کے بعد بھی واہمہ کی صورت بندی اور اصنام خیالی تراشنے سے نجات نہیں حاصل کر سکے یہ بات ان کی شاندار شاعرانہ یا پر تکلف عملی زندگی میں پریشان کن بھی ثابت نہیں ہوئی اس لیے کہ ان کا گرد و پیش ان چیزوں کے لیے کوئی خاص مزاحمت نہیں رکھتا تھا۔

ناسخ کے نہاں خانوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہوگا کہ وہاں عہد وحشت و قدامت کا ایک آدمی موجود ہے جو اُن کی خیال آفرینی کو نہ صرف خام مواد مہیا کرتا ہے بلکہ توسن فکر رواں کو جبلّتوں کے کوڑے سے ہنکاتا رہتا ہے۔ ناسخ کے علاوہ اگر ہم تلاش کریں تو فرق و اختلاف کے باوجود اس عہد کے شاعروں میں انشاءاللہ خاں انشا کے یہاں بھی یہی بات نظر آئے گی۔ ناسخ کے اندر چھپا ہوا یہ آدمی 'یا دیوزاد'، 'یا ہمزاد' واہمہ اور جبلّت کے سہارے سے سوچتا ہے اس کے خیالات نہایت پریشان اور منطقی ربط و ارتباط سے بالکل بیگانہ ہیں اس لیے کہ وہ صنّاع نہیں ہے اور اظہار کے خوبصورت ذرایع کا مالک نہیں ہے جب اس اندرونی ناسخ کا رابطہ ایک بیرونی ناسخ سے پیدا ہوتا ہے جو صنّاع بھی ہے اسالیب اظہار کا حاکم بھی ہے اور تہذیب و منطق کی

پروردہ عادتیں بھی رکھتا ہے تو وہ عتیقی مواد اور توہمات پر صنّاعی اور فنکاری کا نہایت دیدہ زیب میک اپ کر دیتا ہے اور اظہار و ابلاغ کی چابکدستی سے واہمہ پر تعقّل اور وحشت پر تہذیب کا غلاف اس طرح چڑھا دیتا ہے کہ پروردہ فنکاری کے پیچھے موجود معشوق کے خط و خال کا دریافت کرنا صاحبانِ نظر کے لیے بھی اکثر مشکل بن جاتا ہے۔

انسان کا جبلّتی نظام خواہشات اور ناآسودہ تمناؤں کا ایک محشرستان اپنے اندر رکھتا ہے، اس کے ذخیرہ میں ان خواہشوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے جن کی بیرونی دنیا کے سخت گیر نظام کی وجہ سے تکمیل نہیں ہو سکتی ہے یہ صورت حال اندرونی کشمکش کی ہنگامہ آرائیاں کبھی کبھی اس شدت کے ساتھ پیدا کر سکتی ہے جو شخصیت کے توازن کو درہم برہم کر دے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

(غالبؔ)

یہ کشمکش حالات کے مطابق نکاسی کی مختلف راہیں ڈھونڈ لیتی ہے جن میں شاعری فنون لطیفہ، خواب اور تصور کی وہ ارسالی کیفیت شامل ہے جسے (Day Dreaming) سے تعبیر کیا جاتا ہے یہ تمام صورتیں ناآسودہ لذتوں کے حاصل کرنے کے مختلف ذرایع ہیں ناسخؔ کے یہاں خود ان کی شاعری کے اندر جو ناآسودہ خواہشوں کو پورا کرنے کا ایک ذریعہ ہے تصوّر کی یہ ارسالی کیفیت بھی شریک رہتی ہے وہ اپنی ایک دنیا یا انجمن تخلیق کر لیتے ہیں جس میں ان کے عتیقی تصور اور دبی ہوئی خواہشات کے مطابق اصنام خیالی کا رقص چلتا رہتا ہے اور وہ اس سے نفسیاتی سطح پر لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں اس پوری صورتِ حال کو اگر عریاں کر کے پیش کر دیا جائے تو مضحکہ خیز بکواس کا ایک سلسلہ نمودار ہو جائے گا

مگر ناسخ فنکار ہیں اس لیے حقیقی دنیا سے حاصل کردہ اظہار و ابلاغ کی جھلملیاں ان پر چھوڑ دیتے ہیں جو پردہ داری کا پورا کام بھی اکثر انجام نہیں دے پاتی ہیں۔ ان کا تصور چشم زدن میں کسی بھی چیز کو منشأ کے مطابق حاضر کر دیتا ہے اور جب وہ ان اشیاء سے اکتا جاتے ہیں تو انھیں ڈھکیل کر باہر کر دیتے ہیں اس طرح وہ نہ صرف اپنی جبلتی خواہشات کی تکمیل کر لیتے ہیں، لذت اندوز ہو لیتے ہیں بلکہ حکومت و اقتدار کی خواہش بھی پوری کر لیتے ہیں ؎

مشق تصویر ہے اسے مشق تصوّر ہے مجھے — اپنی صنعت میں دکھا سکتا نہیں بہزاد کو
آنکھ کی بند بت ہوا موجود — کوئی مجھ سا بھی بت تراش نہیں
گرچہ غربت ہے، تصور میں مگر ہمدم ہے پاس — میری تنہائی بھی مجھ کو انجمن سے کم نہیں
خواب میں سارے مزے وصل کے ہم لوٹتے ہیں — بند آنکھیں ہیں مگر بند کوئی کام نہیں

وہ تصوّر پیشہ ہوں گر ہو مری تربت پہ نخل
ہو ورق ہر برگ کی جا یار کی تصویر کا

ان کے یہاں واہمہ اور اس کی خلاّقی کے عمل پر اگر نظر ڈالی جائے تو مافوق الفطرت خلاّقی کی طرف ان کے خصوصی رجحان کی تاویل ان کے سماجی پس منظر میں بہت آسانی سے ہو سکتی ہے۔ حقیقۃً یہی وہ میدان ہے جہاں ان کی صلاحیتیں اپنے بھرپور امکان کے ساتھ برسرِ عمل ہوتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں شاید انشاء سے بھی زیادہ دیو، جن، پری، راجہ اندر، غول پری زاد، کیمیا گری، آسیب، جادو، روحانی عمل اور ان سے متعلق توہمات کا براہ راست ذکر آتا ہے اور ان چیزوں سے متعلق تشبیہات، استعارات اور رمزیات کا استعمال بھی بکثرت ملتا ہے ؎

اک پری کے عشق نے مجھ کو سلیماں کر دیا — لخت دل نگ ہے تو حلقہ چشم کا خاتم ہوا
ہر ورق بال پری سے ہے مشابہ ناسخ — کہ پری زادوں کے ہے وصف میں دیوان اپنا
مسخر کر گیا لاکھوں پری زاد ان مضمون کو — غضب افسون گری آتی ہے میری طبع موزوں کو

چال کس پری رُو کی وقت فکر یاد آئی — آج کچھ بہت اپنی طبع میں روانی ہے
خاک میں مل جائے ایسا ہی اکھاڑا چاہئے — لڑکے کُشتی دیو ہستی کو پچھاڑا چاہیے

جو پری رُو بیٹھتا ہے آکے اٹھ سکتا نہیں
اب تو نقش بوریا کا خوب میں عامل ہوا

اشعار میں کثرت کے ساتھ دیو، جن، پری وغیرہ کے ذکر پر یا تو خود انھیں توجہ ہوئی یا لوگوں نے توجہ دلائی ہوگی اس کا شاعرانہ جواز انھوں نے قرآن سے نکال لیا جس کی مسلم سماج میں زبان بند اہمیت ہے اب یہ اور بات ہے کہ یہ قرآن مجید کا صحیح استعمال ہے یا غلط۔

کیا گنہ ذکر پری ہے گر مرے دیوان میں — سورۂ جن کیا نہیں ہے زاہدو قرآن میں
یا ایک پری سے وصل تھا آٹھ پہر — یاد دیتے ہیں رنج مجھ کو جن شام و سحر

دنیا کے ہر کلچر اور مذہب میں سانپ کی رمزیہ اہمیت ہمیشہ مسلم رہی ہے۔ تہذیب کے بدلتے ہوئے انداز و مسائل میں جہاں سازشیں ہو رہی ہوں اور ملوکیت والے نظام میں انسانی شکل میں مافوق الفطرت قوتوں کے مطابق عمل فرمائی چل رہی ہو وہاں کسی بھی شاعر کے لیے یہ تمام اشیاء تحفظی سماجی علامتیں بن جاتی ہیں جن کے استعمال سے دل کی بھڑاس اور خوف سے یک گونہ چھٹکارا حاصل ہوتا ہے اور اس بے دریغ دار و گیر سے بھی بچ نکلنے کا موقع پیدا ہو جاتا ہے جس میں مبتلا ہونے کے لیے کسی واقعی قصور کی ضرورت یا جس سے بچنے کے لیے کوئی قانون نظام مددگار نہیں ہو سکتا تھا اس لیے کہ ایسے دور میں جزا و سزا کے پیمانے نہایت شخصی اور کسی بھی متلون المزاج صاحب اثر کی مرضی کے تابع ہوتے تھے اس لیے ناسخ کے اس طرح کے اشعار میں شخصیت کے نہاں خانوں میں جو عوامل برسر عمل تھے ان کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے بیرونی دنیا اور سماجی حقیقتوں کی طرف اشارے کرنے والی فنکارانہ تدبیر کی طرف سے غافل نہیں ہونا چاہیے چند شعر اس طرح کے مزید

درج کیے جاتے ہیں:-

یا کاکل دل دار سے تھا ربط مدام
یا لوٹتے ہیں سانپ مری چھاتی پر
اس رشک پری کے ہجر میں اے یارو
پہنچاتے ہیں آسیب شیاطین مجھ کو

کرتے ہیں پریوں سے کشتی پہلوان عشق ہیں
ہم کو ناسخ راجہ اندر کا اکھاڑا چاہیے

ظاہر ہے کہ پہلوان عشق کا تصور ہی عجیب وغریب ہے شاید اس کا سبب یہ ہو کہ غزل گوئی کی وجہ سے ان کا مصنوعی رابطہ عشق سے قرار پایا اور پہلوانی کا شوق تو بچپن سے تھا اب ایسے پہلوان عشق کے لیے راجہ اندر کے اکھاڑے کی طاقت ور پریوں کے علاوہ کوئی انسانی معشوق خواہ وہ کتنا ہی قوی کیوں نہ ہو خم ٹھونک کر مدمقابل کیوں کر ہو سکتا تھا۔

ان مافوق الفطرت مظاہر کے علاوہ ناسخ کی شاعری میں غُول کا ذکر بھی بہت موجود ہے اردو کے بہت سے قدیم شاعروں کے دیوان میں بھی یہ مخلوق اکثر دکھائی دیتی ہے بہت ممکن ہے کہ یہ ان کے کسی قدیم الجھاؤ نے ایک مؤلّف (Complex) کی شکل اختیار کر لی ہو ہو سکتا ہے کہ عہد طفلی کا کوئی حادثہ اس کے پس پردہ ہو اور اسی الجھاؤ نے ان کی شاعری میں بار بار ظہور کا موقع حاصل کر لیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسی الجھاؤ نے کوئی ایسی غیر معمولی شکل اختیار کی ہو جس نے انھیں تجرد کی زندگی بسر کرنے کا عازم بنا دیا ہو۔

دشت غربت میں جو میں گم رہ ہوا
قبر پر روشن چراغ غول ہے
غول کی آنکھیں چراغ اور آشیاں قندیل ہے
اک شب تاریکی اپنے کنج ویراں میں نہیں
جو چشم اہل وطن میں نہ ٹھہرے کیا پروا
ہماری خاک سے روشن ہیں آنکھیں غولوں کی
ہوں وہ وحشی کہ اگر دشت میں پھرتا شب کو
آگے مشعلچی وہیں غول بیاباں ہوتا

متذکرہ بالا سطور میں جو بحث چل رہی ہے وہ نہ صرف ناسخ کے شعور کو سمجھنے میں یک گونہ معاون ہوسکتی ہے بلکہ ان کے لاشعور کے بھی بہت سے رازہائے سربستہ کو کھولنے میں مددگار ہوسکتی ہے۔ ناسخ کے لاشعور کا مطالعہ عام لاشعور کے مطالعہ کی طرح زیادہ مشکل نہیں ہے اس لیے کہ ان کے لاشعور کا جلوس عام طور پر دردانہ شعور اور فنکاری کے دائرہ میں داخل ہوتا ہے وہ آشکارہ زیادہ اور ناقابل شناخت حد تک پنہاں کم ہے ان کے ذہن کی جن صلاحیتوں اور ان کی شخصیت میں مضمر جن لاشعوری محرکات کا ذکر کیا گیا وہ نہ مکمل ہیں اور نہ مفصل اس سمت میں ابھی بہت سے راز منکشف کرنا آسانی کے ساتھ ممکن ہے مگر یہاں صرف ایک ہی میلان کا ذکر کرکے اس بحث کو تمام کردینا ہے۔ نفسیات کی اصطلاح میں یہ میلان نرگسیت کے نام سے جانا جاتا ہے نرگسیت کیا ہے اور اس کی عملی کارکردگی کے ریشے کہاں تک پہنچتے ہیں اور شعر و فنون لطیفہ سے اس کے خاص تعلق کی نوعیت کیا ہے اس کے لیے مستند تصنیفات کی طرف رجوع کرنا چاہیے یہاں اختصار کے ساتھ یہ بتا دینا ہے کہ ہر بچہ میں جبلّی طور پر خود پسندی اور محبت ذات کا قوی رجحان موجود رہتا ہے جو شروع میں اسے خود غرض رکھتا ہے مگر بعد میں ارتفاع پاکر قوم، ملت اور انسانیت کی محبت بلکہ اس کے لیے قربانی دینے کا اہل بھی بنا دیتا ہے جب رفتہ رفتہ سماجی حالات بچہ کے لیے اپنے خول سے نکلنے کا موقع فراہم کرتے ہیں تو معروضی محبت کی ابتدائی وابستگی بالعموم ماں باپ کی طرف مڑتی ہے۔ لیکن تبدیلیوں ارتفاع اور سماجی تربیت کے بعد بھی یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ محبت ذات کا رجحان فرد سے بالکل ختم ہوجاتا ہے حقیقت تو یہ ہے کہ اسے شخصی اور قومی تحفظ کے لیے کسی مناسب حد تک موجود رہنا چاہیے لیکن اس رجحان کا اگر اعتدال سے زیادہ وجود ہے تو سماجی رویہ اور روابط میں ایسا شخص کسی نہ کسی حد تک غیر معتدل ضرور بن جاتا ہے اس وصف کی بے اعتدالیوں کو بھی دیگر ذرایع کے علاوہ شاعری اور فنکاری کے ذریعہ سے

نہ صرف کم کیا جا سکتا ہے بلکہ دلاویز اور دل کش بنانا بھی ممکن ہے۔ نفسیاتی جائزوں کے مطابق نرگسی رجحان عام طور سے ادیبوں اور شاعروں میں کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے اور ان کے تخلیقات میں بھی نمودار ہوتا رہتا ہے اکثر شعرا خود بینی اور اپنی ذات کی اہمیت جتانے والے مضامین نظم کرتے ہیں تعلی کے ذریعہ سے اپنی تسکین کا سامان بہم کرتے ہیں اور اپنے فن پاروں کی آرائش و تزئین و ترصیع اور نوک پلک درست کرنے کا خاص اہتمام کرتے ہیں بلکہ اسی طرح جیسے نرگسی مزاج شخص بالعموم اپنے میک اپ پر زیادہ وقت صرف کرتا ہے ایسا فنکار بھی گویا فن کو اپنی ذات تصور کر کے اس کی ساخت پرداخت میں منہمک رہتا ہے۔

اس پس منظر کو سامنے رکھ کر ایک ایسے شاعر کا تصور کیجیے جو استاد سے بے نیاز ہو کر اپنے کلام کی اصلاح و آرائش میں ایک عمر صرف کر دیتا ہے وہ صنایع و بدایع کی طرف اسی طرح خصوصی توجہ دے گا جیسا کہ نرگسی شخص اپنی مشاطگی کا خود اہتمام کرتا ہے ناسخ کی ذات پسندی کے رجحان کو حالات نے اور بھی تقویت پہنچائی وہ عیال کے جنجال سے بری تھے کہ جن میں ان کی محبت ذات بٹ سکتی تھی جس ماحول اور تہذیبی ادارہ میں وہ زندگی بسر کر رہے تھے وہ اجتماعی طور پر خود ہی نرگسی تھا۔ ان کے پاس شاگردوں کی اور قدر دانوں کی ایک ایسی بڑی فوج تھی جو ان کے نرگسی رجحان کو اور مہمیز دے رہی تھی یہ اور اس طرح کے بہت سے عوامل نے ان میں نرگسیت کا رجحان کچھ معمول سے زیادہ ہی پیدا کر دیا تھا اور ایک طرح سے انھیں معروضی محبت کے لیے نااہل بنا دیا تھا۔ اعلیٰ غزل گوئی کے لیے کسی واقعی اور حقیقی محبوب کی ضرورت لازماً نہیں ہوتی ہے۔ استعاراتی محبوب سے بھی غزل گوئی کا کام چل جاتا ہے ناسخ معروضی محبت کے اہل نہ تھے اسی لیے جب ان کی غزلوں میں معروضی اظہار محبت یا اس سے حاصل شدہ تجربات اور پیدا شدہ جذبات کے ابلاغ و اظہار کا موقع آتا ہے تو ان کا تصنع یا بے بسی قابل رحم دکھائی دیتی ہے۔ زندگی بھر

ان کا دامن کسی خار سے نہیں الجھا اسی لیے جب وہ گلوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں تو ذوق وشوق کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ ان کا دل ہمیشہ اپنے ہی میں اتنا اٹکا رہا کہ کسی دوسرے کو محبوب بنانا ان کے لیے ممکن تھا اور نہ انھوں نے غالباً کبھی کوشش کی ؎

کسی سے دل نہ اس وحشت سراپا میں نے اٹکایا
نہ الجھا خار سے دامن کبھی میرے بیاباں کا

ناسخ کی سب سے بڑی محرومی یہی تھی کہ ان کا کوئی محبوب نہ تھا اور نہ آتش کی طرح انھیں تصوف سے لگاؤ تھا کہ درد دل کا درماں ڈھونڈنے کے لیے عالم لاہوت میں نکل جاتے حالات نے ان کی جستجو کا مرکز خود انھیں کی ذات کو بنا دیا تھا وہ راہ رو تھے مگر کوئی منزل پیش نظر نہ تھی وہ طالب تھے مگر مطلوب کا کوئی واضح تصور نہ رکھتے تھے اسی لیے باوجود ہر طرح کی استعداد رکھنے کے وہ خود اپنے ہی راز کو نہ پا سکے۔ چند شعر توضیح کے لیے درج ہیں ؎

طرفہ عاشق ہوں مرا معشوق کیا جانے ہے کون
اور تو کیا خود نہیں واقف میں اپنے راز سے

سودائے عشق غیر کہاں ہے برنگ گل
اپنے ہی حسن پر میں گریباں دریدہ ہوں

عاشق ہوا ہوں دوستو میں اپنی شکل کا
میرا ہے عکس آئینۂ رویے یار میں

غفلت سے اپنا طالب دیدار ہوں میں آپ
میرا ہی چہرہ ہے جو نہاں ہے نقاب میں

اٹھ گئی جب سے دوئی ناسخ تو کہتا ہے یہی
آپ ہی شاہد ہے آپ ہی رند شاہد باز ہے

ناسخ کے یہاں مشاہدات کی دنیا وسیع ہے مگر ان کے زیادہ تر مشاہدات انسانی ربط سے عاری ہیں اور زبان و بیان کے حسن کے باوجود اندرونی طور پر معکوس ہیں اور یہی سبب ہے کہ جب وہ معکوس مشاہدات کو قوت متخیّلہ کے شکنجے میں کس کر سیدھا بنانے کی کوشش کرتے ہیں تو اکثر یہ کوشش کامیاب ہونے کے باوجود آورد کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ پاتی اور تخلیق کا ایسا نمونہ نہیں قرار پاتی جو شائستہ غزل ہو۔ غزل تو ایک منزل پر آبگینہ سازی کا فن بن جاتی ہے شکنجہ اور داب کو برداشت نہیں کر سکتی ہے۔ ناسخ کے کاروبار شوق و عشق کا یہی سب سے بڑا نقص ہے جس کی وجہ سے وہ استادی اور عاشقی میں توازن نہیں قایم رکھ سکتے۔ اسی لیے جب خالص غزل کے مضامین سے ہٹ کر دوسرے مضامین پر طبع آزمائی کرتے ہیں تو موضوع اور فن دونوں ہی کے ساتھ انصاف کرتے ہیں اور غالباً یہی راز تھا کہ ان کی غزلوں میں ایسے مضامین جن کو روایتی اعتبار سے غزل میں کمتر ہی جگہ ملتی افراط کے ساتھ موجود ہیں اس لیے کہ یہی وہ میدان ہیں جہاں اچھے شاعر اور لائق استاد کی حیثیت سے ان کی کامیابی یقینی بنتی ہے۔ ان پر فیصلہ دیتے وقت اسی لیے آرا میں تضاد بھی نمودار ہوا کچھ نقادوں کا یہ کہنا ہے کہ انھوں نے بکثرت غزل میں ایسے مضامین داخل کر دیے جن کا غزل سے کوئی تعلق نہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ غزل صنف کے اعتبار سے ایک جگہ پر منجمد نہیں رہ سکتی۔ سماجی تغیّرات اور معاشرتی آفاق کی توسیع کے ساتھ غزل میں لاکھ بندش کے باوجود عمودی اور افقی توسیع پیدا ہونا ضروری تھی اور اس اعتبار سے ناسخ کو ایک بڑا مرتبہ دینا ضروری ہے اس لیے کہ انھوں نے غزل میں اپنے عہد کے سارے شاعروں سے زیادہ توسیع کی

اوران کے معاصرین پر یاان کے بعد غزل میں جاری رہنے والی توسیع میں جس کا سلسلہ آج تک چل رہا ہے ناسخ کا بھی اثر ہے، ناسخ کی اس توسیعی کوشش میں خالص غزل تو رہ گئی لیکن دخیل موضوعات کو ناسخ کے یہاں پھلنے پھولنے کا خوب موقع ملا۔ اخلاق، عبرت، گردش لیل و نہار، پند و نصائح، خودداری، عزت نفس، عالی ظرفی، شرافت و نجابت کا احساس، ایثار و قربانی اور اسی قبیل کے دوسرے مضامین جب ان کی غزلوں میں نمودار ہوتے ہیں تو خوش گوار اثر پیدا کرتے ہیں اور ایسے مضامین باندھنے میں وہ اپنے ہم عصر شعرا سے کہیں آگے رہتے ہیں ان کی موّاج قوت متخیلہ، فنکاری کا تنوع اور بلند آہنگ استادانہ قدرت ایسے ہی مواقع پر جاندار، فعّال اور زرخیز دکھائی دیتی ہے اس طرح کے اشعار بھی ناسخ کے یہاں بکثرت ہیں ؎

ناسخ نہ ہو جیو مگس خوان اغنیار — سنتا ہوں یہ سخن لب نان جوین سے

غم نہیں ہے فلک جو تاج نہیں ہے — ہم کو سر کی بھی احتیاج نہیں ہے

خوار جو ظاہر میں ہیں ان کو حقارت سے نہ دیکھ — کیمیا گر پھرتے ہیں اکثر گدا کے بھیس میں

بات جن نازک مزاجوں سے نہ اٹھتی تھی کبھی — بوجھ ان سے سیکڑوں من خاک کا کیوں کر اٹھا

اس قدر مجھ کو بخیلوں سے پڑا دنیا میں کام
اتنی شہرت پر یقین ہمت حاتم نہیں

دنیا کے عبرت انگیز آلام و حوادث پر سب ہی بڑے شاعروں نے مختلف انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ میر کے یہاں عبرت کی یہ ابدی داستان کسی بادشاہ کے ایسے سر کا رمز یا علامت کا پیرایہ اختیار کرتی ہے جو پر غرور رہنے کے باوجود اب محض استخواں اور شکستوں سے چور ہے۔ غالب کے یہاں یہی داستان داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی ایک خاموش شمع کی علامت میں ظاہر ہوتی ہے۔ فردوسی کے یہاں یہی مفہوم بوم کی نقّارہ زنی کا آہنگ اختیار کر لیتا ہے۔ ناسخ نے بھی اس آفاقی موضوع کو متعدد

موقعوں پر دل نشیں و دل گداز انداز سے پیش کیا ہے ان میں سے بعض قطعہ بند اشعار کو 'ادب عالی' کے زمرہ میں رکھا جا سکتا ہے ؎

تماشائے جہاں ہم دیکھتے ہیں کنج عزلت میں — ہمارے بوریے کا نقش خط ہے ساغر جم کا
گزر ناگاہ جو میرا ہوا شہر خموشاں میں — عجب نقشہ نظر آیا وہاں شاہان عالم کا
کہیں آئینۂ زانو سکندر کا شکستہ تھا — کسی جانب پڑا تھا کاسۂ سر خاک میں جم کا

وصل کی شب ہو چکی صبح قیامت ہے عیاں — صور کی آواز ہے مرغ سحر نالاں نہیں
کل تلک آراستہ دیکھی تھی جس جا بزم رقص — آج واں کوئی بگولوں کے سوا رقصاں نہیں

کل جہاں چاؤش کرتے تھے صدائے دور باش
غیر شیر و گرگ آج اس جا کوئی درباں نہیں

جبر و اختیار کا موضوع بھی ہزاروں سال سے شاعروں اور فلسفیوں کے زیر مشق رہا ہے۔ یہاں دوسرے شاعروں سے کوئی تقابلی بحث مطلوب نہیں ہے ناسخ نے بھی اس موضوع پر کچھ دل نشیں شعر کہے ہیں جن میں ایسی ندرت ضرور موجود ہے کہ وہ نہ صرف ناسخ کے اچھے انتخاب میں جگہ پا سکتے ہیں بلکہ اگر اس موضوع پر اردو کے شعراء کے اشعار کا کوئی جامع انتخاب کیا جائے تو اس میں بھی انھیں جگہ مل سکتی ہے۔

گرچہ جبری نہیں ہوں میں لیکن — کچھ محبت پہ اختیار نہیں
نہ کر سکا میں کوئی کام حسب خواہش دل — سوائے جبر نہیں خاک اختیار مجھے

لیکن جو شعر خاص ان کے حصہ کا ہے اور مضمون تازہ کہا جا سکتا ہے وہ حسب ذیل ہے ؎

چلا عدم سے میں جبراً تو بول اٹھی تقدیر
بلا میں پڑنے کو کچھ اختیار لیتا جا

آرزوؤں کی پامالی بھی ہمیشہ سے سماجی بے انصافیوں کا متواتر عمل رہی ہے اور فطرتاً شاعر کے شخصی 'خون آرزو' سے مل کر غزل کا بھی دل نشین موضوع رہی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس میدان کو وہی شعرا سر کر سکتے ہیں جنھیں ناکامیوں سے نہ صرف حقیقی سابقہ پڑا ہو بلکہ ناکامیوں سے کام لینے کا سلیقہ بھی آتا ہو۔ ناسخ محرومیوں اور حقیقی ناکامیوں سے شاید کبھی دوچار نہیں ہوئے وہ پریشانیوں میں ضرور مبتلا رہے جلاوطنی میں انھوں نے فقدان راحت کا بھی بہت تجربہ کیا تھا اودھ کی سیاسی زندگی میں پڑ کے قید و بند کے علاوہ قتل و ہلاکت سے اگرچہ وہ بچ نکلے لیکن خوفناک تجربات سے تو گزرنا ہی پڑا ان ہی اسباب کی بنا پر کچھ اچھے اشعار ان کے دیوان میں مل جاتے ہیں ایسے اشعار زیادہ تر ان کے دیوان دوم جس کا نام 'دفتر یشان' ہے میں ملتے ہیں ؎

کیا ہاتھ اٹھاؤں بہر دعا سوئے آسمان — برآئے جو کبھی وہ مری آرزو نہیں
آتی ہے عالم بالا سے صدا مانگ سو دون — امتحان کو بھی ہیں کبھی سائل نہ ہوا
ساغر امید خالی رہ گیا تو رہ گیا — ساقیا ہم اپنا جام زندگانی بھر چلے

نہ ہو کچھ آرزو مجھ کو خدایا
یہی ہر دم دعا ہے اور میں ہوں

یہ کیفیت کبھی کبھی خیال کی لہروں کو اس طرح بھی چھیڑ دیتی ہے کہ جس سے اسی موضوع پر غزل مسلسل وجود میں آجاتی ہے۔

غیر حسرت لے گیا یاں سے کوئی کیا اپنے ساتھ — آسمان سے کس توقع پر میں دولت مانگتا
ہاتھ اٹھا کر دونوں عالم سے خدا کے سامنے — کیا میں اس وحشت سراپا میں غیر وحشت مانگتا
گر طلب فوج و نشاں کرتا تو ملتے اشک و آہ — ہاتھ آتی سینہ کوبی گر میں نوبت مانگتا
موج آب زندگی سے کام لیتا تیغ کا — خضر بھی ملتا تو میں جام شہادت مانگتا
یہ تڑپنے میں مزا مجھ کو ملا ہے بعد ذبح — موت سے ملتی تو اور ایک دم کی مہلت مانگتا

آگے کشت آرزو کے آبرو میری رہی
برق ہی گرتی جو میں باران رحمت مانگتا

ہر حساس طبع فرد اور خاص طور سے شاعر داخلی طور پر کسی نہ کسی حد تک ناآسودہ اور بے چین ہوتا ہے اگر یہ بے چینی اعتدال کے حدود سے تجاوز کر جائے تو ظاہر ہے کہ شخصیت مریض ہو جاتی ہے لیکن ناموافق حالات اور اندرونی بے چینی اگر صحیح رشتہ ادراک سے وابستہ ہو جائیں تو مل جل کر شاعروں کے یہاں ایسی فنکارانہ بے چینی (Artistic Anxiety) کو جنم دیتی ہیں جو اچھے اشعار کے لیے نہایت زرخیز خام مواد کا کام دیتی ہے۔ فنکارانہ بے چینی نے دنیا کے ہر ادب میں تخلیق کے بے بہا نمونے پیش کیے ہیں اردو زبان کے بھی بہترین اشعار اکثر ان ہی شاعروں کے کہے ہوئے ہیں جنھوں نے اس بے چینی کا صحت مند اور تعمیری استعمال کیا ہے۔ ناسخ کے متعلق اگر عام طریقہ پر سوچا جائے تو غالباً یہی گمان ہوگا کہ وہ کسی تہ نشین بے چینی کا شکار نہیں تھے لیکن اگر گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بظاہر بھاری بھرکم نظر آنے والی ان کی شخصیت بھی اسی داخلی کرب اور بے چینی کا کبھی کبھی شکار ہوتی تھی جو فنکاروں کے حصّہ میں بالعموم آتی ہے جب تک گرد و پیش کے حالات موافق رہے اس بے چینی کو ابھرنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن زندگی کا ایک اچھا خاصا حصّہ انھوں نے ایسا بھی بسر کیا ہے جس میں نہ صرف وہ بے چین اور ناآسودہ رہے بلکہ فنکاری میں اسے ڈھالتے بھی رہے۔ ان کا دوسرا دیوان اسی عہد اور انھیں حالات کی زیادہ تر کمائی ہے اسی لیے اس میں بہت سی ایسی چیزیں دستیاب ہوتی ہیں جن کی ہمیں غزل میں تلاش رہتی ہے پہلے دیوان والے ناسخ کے مقابلہ میں دوسرے دیوان والا ناسخ غزل کے تقاضوں سے قریب تر دکھائی دیتا ہے۔ اس دیوان میں فخر و ادعا کے مضامین چھوڑ کر جہاں انھیں اپنے لیے صیغہ متکلم استعمال کرنے کا موقع ملا ہے، اندرونی طور پر ایک زخم خوردہ ناسخ بھی ابھر کر سامنے آتا ہے ظاہر ہے کہ یہ نیا ناسخ پرانے ناسخ کے مقابلہ میں کافی مختلف ہے جسے ہم شخصی

اور فنی ٹھاٹ باٹ کے ساتھ دیکھتے اور پہچانتے آئے ہیں ؎

نخل بریدہ ہوں مجھے کیا برگ و بار سے
شاخ شکستہ ہوں نہیں مطلب بہار سے

ہم خانہ خرابوں سے ملے کیا کوئی آکر
دروازۂ افتادہ ہے دربان ہمارا

ڈر تھا اثر کا اس کے سو وہ بھی نکل گیا
نادم ہوا ہوں منھ سے میں نالہ نکال کر

پوچھا اے ناسخ نہ کچھ میری اداسی کا سبب
آپ میں دن رات حیران ہوں ہوا ہے کیا مجھے

تمام عمر یوں ہی ہو گئی بسر اپنی
شب فراق گئی روز انتظار آیا

اس طرح کے شائستہ اشعار کے ساتھ ساتھ ان کے کلیات میں مبتذل اور ذوق سلیم پر گراں ہونے والے اشعار کی بھی کوئی کمی نہیں ہے یہ اشعار جنھیں حقیقۃً شعر کہنا بھی درست نہ ہوگا عیوب ناسخ کی طرف راہنمائی کے علاوہ اور کوئی فرض انجام نہیں دے سکتے۔ لیکن اس قبیل کے اشعار سے ناسخ کی قدر و قیمت کے متعلق آخری فیصلہ کر دینا درست نہیں ہوگا۔ میر، سودا، آتش بلکہ غالب کے یہاں بھی معیار اور شان سے گرے ہوئے اشعار کچھ نایاب نہیں ہیں اور نہ ان کے وجود سے ان بڑے شعرا کا مرتبہ گھٹتا ہے ناسخ کے اس طرح کے چند اشعار فقط مطالعہ میں جامعیت پیدا کرنے کی نیّت سے درج کیے جا رہے ہیں ان اشعار کے مضمون اور رویّہ پر غور کرتے وقت اس نوابی ماحول اور اس کے مشاغل پر نظر رکھنا بھی ضروری ہے جو ان کی تخلیق کے زیادہ تر ذمہ دار ہیں۔

سوچ ہے جب سے کبوتر لے گیا ہے خط شوق
کوئے جاناں میں رقیب اپنا کبوتر باز ہے

تو نے شہباز نگہ کو جو ادھر چھوڑ دیا
ہم نے بھی طائر دل باندھ کے پر چھوڑ دیا

لکھ لکھ کے حال اس کے محل پر گرائے
قاصد نہیں دلا کوئی بہتر پتنگ سے

دے ڈوپٹہ تو اپنا ململ کا
ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

ایک مختصر تعداد ان کے دیوان میں ظریفانہ اشعار کی بھی ملتی ہے اسی طرح کہ. جیسے دو چار شعر تصوف کے بھی مل جاتے ہیں مگر مولانا آزاد کا یہ خیال درست ہے کہ وہ تصوف کے آدمی نہ تھے؛ تصوف کا کوچہ کچھ اور ہی ہے جس سے یہ واقف نہیں ہیں'۔ یہی بات کم و بیش ان کی ظرافت کے متعلق بھی کہی جاسکتی ہے وہ صاحب دل و حال نہ تھے اس لیے آتش کی طرح اپنی غزلوں میں تصوف کی پاکیزہ فضا نہ پیدا نہ کر سکے وہ مزاج اور شخصیت کے اعتبار سے صاحب وقار و تمکنت تھے ہنسنا تو درکنار ان کے لیے مسکرانا بھی ایک مشکل کام تھا فطرت کے اعتبار سے وہ شگفتہ مزاج اور زندہ دل نہ تھے کبھی کبھی بتکلف وہ اس کوچہ میں آجاتے تھے اور اکثر ناکام رہتے تھے۔ ان کی ظرافت کسی اعلیٰ مقصد کی طرف راہ نمائی بھی نہیں کرتی ہے آزاد کا فیصلہ ہے کہ ان کی ہنسی بھی زہر خند معلوم ہوتی ہے انھوں نے اپنے متعلق ایک شعر کہا ہے ؎

تند خو ظاہر میں ہوں باطن میں ہوں باغ و بہار
جس طرح کانٹے لگے ہوں باغ کی دیوار پر

مگر نہ تو ان کے سوانح حیات اور نہ ان کے کلیات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

زندہ دلی سے محرومی ناسخ کا قابل افسوس نقص ہے اگر وہ زندہ دل ہوتے تو سودا کے برابر ہوتے۔ حالانکہ انھوں نے زندہ دلی کے موضوع پر ایک ایسا شعر کہا ہے جو بے حد خوشگوار ہے اور ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور زندگی کے متعلق بڑے صحت مند نقطہ نظر کا حامل ہے۔

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

مگر عملی زندگی میں اور ان کے فن میں ان کی زندہ دلی اور زندگی کے متعلق اس نقطہ نظر کا کوئی اثر نہیں دکھائی دیتا ہے انھیں مردہ دل بھی نہیں کہا جاسکتا اس لیے کہ سنجیدگی

موت کے مترادف کبھی نہیں سمجھی جا سکتی۔

ان کے یہاں طنزیات کا بھی کچھ سرمایہ موجود ہے لیکن طنز کا بیج ظرافت کی زمین میں بویا جاتا ہے۔ طنز کے نشتر ہمیشہ ظرافت کی سان پر تیز کیے جاتے ہیں اسی لیے بغیر اچھی ظرافت کے اچھا طنز وجود میں نہیں آسکتا۔ ناسخ کے طنز بھی نشتریت اور لذیذ چرکا لگانے کی اہلیت نہیں رکھتے ہیں ان کی ظرافت اکثر پھبتی کی نوعیت رکھتی ہے اور ان کے طنز کند ہتھیار کی ضرب معلوم ہوتے ہیں۔ مجموعی طور پر ان کے ظریفانہ اور طنزیہ ذخیرہ میں کم تر ہی ایسے اشعار ملیں گے جو خانہ یادداشت میں دیر تک ٹھہرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

اس قدر خشک ہوا زاہد بے دین گویا
سرِ مسواک ہوا گنبد دستار بلند

نظر آتے ہیں یوں اغیار ترے گرد اُلّو سے
بشر کو جانور جیسے بنا رکھتے ہیں جادو سے

اس پری رخسار پر پھبتی کہی ہے حور کی
سچ تو یہ ہے سوجھتی ہے کیا ہی مجھ کو دور کی

تجھ کو ناسخ ہے عبث اس کا خیال
وہ رقیب روسیہ کیا مادہ ہے

کیا ہی منھ کرتا ہے ٹیڑھا دیکھتا ہے جب مجھے
کر دے یارب روئے دشمن لقوے کا آزار کج

مثالوں کی تعداد بڑھائی جا سکتی ہے لیکن کسی ایسے شعر کا دریافت کرنا جو اپنی ظرافت سے خالص ذہانت کو متاثر کر سکے، مشکل ہے

حقیقتاً ناسخ کا مطالعہ ایک شاعر کے مطالعہ سے کہیں زیادہ ایک اسلوب، ایک تحریک اور ایک دور اور اس کے ادبی عزائم کے مطالعہ کی حیثیت رکھتا ہے جس نے مجموعی طور پر اردو زبان کے ادبی رجحانات کو ایک طویل زمانہ تک کسی بھی دوسری تحریک سے زیادہ متاثر کیا۔ ناسخ کے عہد اور راہنمائی میں جو دور رس تبدیلیاں ہوئیں انھیں صحیح معنوں میں اردو گیر تبدیلیاں کہا جاسکتا ہے۔ ہندستان کا کوئی خطّہ اور کوئی ادبی مرکز ایسا نہ تھا جہاں ناسخ کے اثرات نہ پہنچے ہوں بلکہ ان اثرات کی نشاندہی، ہر چند کہ ناسخ کا عہد ختم ہو چکا ہے عہد جدید کے ادب میں بھی کی جاسکتی ہے یہ اثرات ناسخ ایک فرد کے نہیں ہیں بلکہ ناسخ کی اس ادبی میراث اور روایت کے ہیں جو اب اردو زبان اور اس کے مزاج و تاریخ کا جزو بن چکی ہے۔ ناسخ سے بڑے شاعر اردو میں بہت گزرے ہیں مگر انفرادی طور پر بعض حیثیتوں سے ان سے زیادہ اثر انداز ہونے والا کوئی دوسرا شاعر نہیں پیدا ہوا ہے۔ آتش ناسخ کے معاصر تھے اور بحیثیت شاعر کے ان سے بہتر تھے۔ مگر مجموعی اثر و نفوذ میں ناسخ کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ خود آتش کے شاگرد آتش سے زیادہ ناسخ کے شاگرد معلوم ہوتے ہیں۔ اردو کی ادبی دنیا میں اگر کسی شاعر کو واقعاً حکمرانی کا موقع ملا ہے تو وہ ناسخ ہی تھے ان کے ادبی فیصلے مقبول قانون کی حیثیت رکھتے تھے۔ میر نے اپنے فرمائے ہوئے کو مستند کہا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ میر کے عہد میں ان کا فرمایا ہوا اتنا مستند ہرگز نہیں سمجھا جاتا تھا جتنا ناسخ کا فرمودہ ان کے عہد میں، ناسخ زبان و ادب کا قانون بنانے اور ان پر عمل کرانے پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ اسی لیے ان کی شاعری چاہے دب گئی ہو مگر اردو میں لسانی انتشار اور قوانین شعر کی غیر معیاری کیفیت جو عرصہ

تک مسلط رہی ہے ناسخ کی وجہ سے دور ہوئی زبان وادب کے قوانین حکومتی قوانین کی طرح نہیں بنتے ہیں اسے سماج وضع کرتا ہے اور مناسب راہنمائی کی وجہ سے ان کی نسبت کسی ایک فرد کی طرف ہو جاتی ہے۔ ناسخ نے بھی صاحبان زبان کی جانب سے اردو کی مستند گرامر اور شعراء کی طرف سے اردو شاعری کے لیے ایک مربوط منظم اور ماضی کے تجربات سے فیض یافتہ بوطبقاوضع کی جو ابھی تک کلاسیکی شاعری اور کلاسیکی مزاج رکھنے والوں کے کام آرہی ہے۔ ان کی ہمہ گیری اور قانون ساز کے ایسی اہمیت اس بات سے واضح ہے کہ اردو کی تاریخ میں کسی بھی شاعر کے نام سے انفرادی طور پر کوئی اسکول منسوب نہیں کیا جاسکا ہے۔ میر اسکول، سودا اسکول، ذوق اسکول، غالب اسکول کی اصلاحیں ہمارے یہاں رائج نہیں ہیں مگر ناسخ اسکول نہ صرف ایک اصطلاح ہے بلکہ حقیقت بھی ہے۔

ناسخ کے کارناموں، شعری میلانات اور فن کے متعلق تصورات اور ان کی تاریخی اہمیت کو سمجھنے کے لیے خود ان کا تخلص ایمائی اور اشاراتی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر اس تخلص کو اختیار کرنے میں ان کے شعور و تفکر کی کارفرمائی موجود تھی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ انھوں نے بہت جلد اور اپنی فنکارانہ زندگی کے آغاز ہی میں اس سارے انتشار پراگندگی اور وحشی پن کو سمجھ لیا تھا جو اردو زبان وادب پر ان کے عہد تک مسلط تھا اور ہر چند کہ بہت بڑے بڑے شاعر پیدا ہو چکے تھے مگر صورت حال میں کوئی بڑی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی انھوں نے اپنے ارادوں، منصوبوں اور مجاہدانہ عزم کی ترجمانی کے لیے ناسخ تخلص اختیار کیا اور پوری عمر یکساں نقطہ نظر اور یک سمتی ریاضت سے اپنے کو اس تخلص کا اہل اور مسمیٰ کو اسم کے مطابق بنائے رکھنے میں کبھی غفلت اور کوتاہی نہیں کی۔ وہ انیسویں صدی بھر ناسخ رہے اور واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے جزوی طور پر سہی لیکن اردو کے ہر بڑے شاعر پر خط نسخ کھینچا گویا ایک فرد نے سیکڑوں شاعروں

کی بنائی ہوئی تاریخ کے کافی بڑے حصّہ کو منسوخ کر دیا۔ بیسویں صدی میں اب ان کے منسوخ ہونے کی نوبت آئی لیکن وہ جس قدر بھی منسوخ ہوئے وہ سماج اور اس کے بدلتے ہوئے انداز کا مجموعی عمل ہے بیسویں صدی کے کسی شخص یا شاعر کا انفرادی کارنامہ نہیں ہے۔ اصلاحات کا عمل ہر دور میں جاری رہتا ہے مگر بیسویں صدی نے مل کر بھی اتنے اصلاحات (انحرافات کا ذکر نہیں) کی روشن بندی نہیں کی جتنی ناسخ نے تنہا انیسوی صدی میں انجام دی۔

ناسخ کے اصلاحات کو عام طور سے زبان تک محدود سمجھا جاتا ہے مگر انھوں نے غزل میں بھی اصلاحات کا عمل جاری کیا۔ گذشتہ صفحات میں توسیع غزل کے سلسلہ میں ان کی سعی کا ذکر کیا جا چکا ہے غزل کی موضوعاتی توسیع ناسخ کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ جب غالب تنگنائے غزل کے احساس میں مبتلا تھے اس سے پہلے ہی ناسخ غزل کو امکانی اعتبار سے اور عملی اعتبار سے بھی ایک سمندر میں نہ سہی مگر ایک بحیرہ میں تبدیل کر چکے تھے آج جدید غزل اور جدید غزل گو کے سامنے توسیع کا مسئلہ ہے اس توسیع کی بنیاد اپنی صدی کے حالات کے مطابق ناسخ ڈال چکے ہیں اب معاصر غزل گو شاعروں کے پاس مناسب توسیع کے لیے معاصر ذہانت کی ضرورت ہے۔ اس صدی میں غزل کے خلاف بڑا رد عمل رہا ہے اور غزل کی جان جاتے جاتے بچی ہے۔ ایسے میں غزل کی جان بچانا در پردہ ناسخ اور ان کے معاصر شعراء کی اس توسیعی کوشش کا بھی نتیجہ ہے جو انیسویں صدی میں بروئے کار آچکی تھی اور جس نے غزل میں ایسی توانائی پیدا کر دی تھی کہ جس کی وجہ سے وہ ابھی تک متزلزل اور منہدم ہونے سے بچی ہوئی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ناسخ بحیثیت غزل گو کے اونچے منصب تک نہ پہنچ سکے اُس اونچے منصب تک جو ان کے بہت سے بیشرو، معاصر اور متاخر شعراء کو حاصل ہوا مگر اس سے ناسخ کی اہمیت کم نہیں ہوئی اس لیے کہ نظریہ سازوں کا عام طور سے یہی انجام ہوتا ہے۔ میتھو آرنلڈ بڑا شاعر نہیں تسلیم کیا گیا۔ سرسیّد بذات خود

بڑے ادیب نہ تھے۔ حالؔی بہرحال دوسرے درجہ کے شاعر تھے اگر مقدمہ نہ لکھتے تو شاید اول درجہ کے شاعر ہو جاتے۔ یہ سب بڑے نظریہ ساز بہرحال تھے۔

انیسویں صدی کے وسط تک اردو شاعری خواہ وہ لکھنؤ کی ہو یا دہلی کی فحشیات اور غیر اخلاقی مضامین سے داغدار رہی ہے ایسے اشعار اور وہ بھی قلت کے ساتھ نہیں اردو کے کس بڑے شاعر کے یہاں نہیں ملتے ہیں، کہ جنھیں کسی شائستہ بزم میں سنانا ممکن نہیں ہے عہد ناسخ میں بھی اس طرح کے اشعار کی جو بھرمار تھی وہ واقف کاروں پر مخفی نہیں ہے۔ اس عہد میں غیر اخلاقی مضامین کا نظم کرنا برا سمجھا جانے کے بجائے جیسے غزل و شاعری کی منظور شدہ روایت تھی۔ محبوب کے سراپا میں نہایت ہوس انگیز باتوں کا ذکر اور معاملہ بندی میں جلوتی معیار سے نہایت گرے ہوئے مضامین کا ذکر اساتذہ کے یہاں موجود ہے، ایسے ہنگامہ میں اس رجحان اور جنس ارزاں کے خلاف آواز بلند کرنا شاید ناممکن بن گیا تھا۔ ناسخ نے اس عظیم فرض کو انجام دیا اور اپنی بلند آوازی اور ادب پر حکمرانی کا فائدہ اٹھا کر بہت جلد غزل کو اس ماحول سے جس قدر ممکن تھا نکالنے کی کوشش کی۔ ناسخ کے حریف اور معاصر آتش کے کلام کا مطالعہ یہ سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ یہ کتنا مشکل کام تھا جسے ناسخ نے انجام دیا اس لیے کہ آتش کے یہاں بھی باوجود تصوّف کے اثر کے فحش و عریاں اشعار کی کمی نہیں ہے۔ اس عہد کے تمام بڑے شاعروں کے مقابلہ میں ناسخ کا کلام گندگی، عریانی، رکاکت، فحش معاملہ بندی پھوہڑپن، ہوسناکی جنسی کج فکری کے مضامین سے جس قدر پاک اور اخلاق و تہذیب کے مستند معیاروں کے مطابق مضامین سے جس قدر مالا مال ہے اس سے ناسخ کی شعوری سعی و ریاضت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے پورے کلیات میں غیر معیاری مضامین کہیں خال خال دکھائی دیں گے جس سے ان کی مجموعی اخلاقیات پسندی پر کوئی خاص حرف نہیں آتا ہے۔ ناسخ کی اس کوشش سے اگرچہ غزل کا رنگ بالکل بدل نہیں گیا بلکہ خود ناسخ اور آتش کے شاگردوں

میں عریانی اور فحش معاملہ بندی نظم کرنے کا رجحان کسی حد تک چلتا رہا ادبی تغیرات اور ان کے اثرات دیر میں جگہ پکڑتے ہیں ناسخ نے ایک مستحکم روایت یا نقطہ نظر کی بنیاد رکھ دی تھی جس نے رفتہ رفتہ غزل کو زیادہ با اخلاق اور مہذب بنا دیا۔

ناسخ ان شاعروں میں ہیں جن کے متعلق زیادہ تر سرسری فیصلے کیے گئے ہیں ایسے فیصلوں کی کچھ تفصیل گزشتہ صفحات پر موجود ہے ان کے فن کی چند عام خصوصیتیں جائزہ لینے والوں پر اس قدر مسلط ہو جاتی ہیں کہ دوسرے اطراف کی جانب توجہ کرنے کا عام طور سے موقع ہی نہیں ملتا۔ خود اس مطالعہ میں بھی ان کے ایسے ہی اوصاف پر زیادہ بحث کی گئی ہے اگرچہ درمیان میں ان کے دوسرے رخ کی طرف بھی اشارے ہوتے رہے ہیں وہ غزل کے اس دھیمے لہجے کی نمائندگی نہیں کرتے ہیں جس کی دو ڈھائی سو سال سے ہمیں عادت ہے لیکن فن اگر زندگی کی نمائندگی کا نام ہے تو ہر وہ فنکار جو زندگی کے کسی نہ کسی رنگ کی نمائندگی کرتا ہو بہر حال اہمیت کا مالک ہوگا اگر پوری زندگی پر نظر ڈالی جائے تو وہ نہ محض سوز و گداز ہے نہ صرف نوحہ و شیوں ہے بلکہ زندگی اس تسلسل کا نام ہے جو نشاط و غم کے مد و جزر پر قایم ہے حیات کا مجموعی تصوّر تعمیر میں مضمر خرابی اور تخریب میں مضمر بشارت پر موقوف ہے زندگی نہ صرف سیاہ ہے نہ سفید، نہ محض غم ہے نہ خوشی، نہ فقط فروغ آفتاب ہے اور نہ خون انجم نہ صرف عشق و جنون ہے اور نہ حسن و فرزانگی اور نہ محض سادگی ہے نہ پرکاری بلکہ ایک ایسی قوس قزح ہے جس میں فضائی تبدیلیوں کے ساتھ سب ہی رنگ نمودار ہوتے رہتے ہیں اس تنوع اور رنگارنگی کے پیش نظر یہ بات ممکن ہی نہیں ہے کہ کسی عہد کے جملہ خصوصیات اور زندگی کے نقشہائے رنگارنگ کی مکمل نمائندگی کسی ایک شاعر یا فنکار سے سرانجام ہو سکے بڑا فنکار وہی ہے جو زندگی کی بہت سی سمتوں کو یا ایک وصف کو بڑی گہرائی کے ساتھ اپنے فن میں سمیٹ سکے۔ جس طرح ایک سماج کی نمائندگی میں سب ہی

طبقات مجموعی طور پر شریک رہتے ہیں اسی طرح زندگی کو مکمل جامعیت کے ساتھ پیش کرنا بڑے فنکاروں کی اجتماعی کوشش سے ممکن ہے کسی تنہا شاعر کی فنکاری پوری زندگی کا بدل نہیں ہے اگر ہم میرؔ اور غالبؔ ہی کی مدد سے اس عہد کی پوری زندگی اور اس کے اساسی نقطہ نظر کو سمجھنا چاہیں تو ہمارا مطالعہ اچھا ہونے کے باوجود ناقص رہ جائیگا اور ہمارے مجموعی تصور میں ایسا خلارہ جائے گا جس کو پورا کرنے کے لیے سوداؔ، انشاؔ، ناسخؔ جرأتؔ، آتشؔ، شاہ نصیرؔ اور ذوقؔ وغیرہ کو شریک کرنا پڑے گا۔

ناسخؔ کا مقام اس خلا کو پورا کرنے میں جو میرؔ اور غالبؔ وغیرہ سے چھوٹ رہا ہے بہت اہم ہے وہ حقیقۃً میرؔ اور غالبؔ کے درمیان کے شاعر ہیں اور دونوں ہی کی تکمیل کرتے ہیں اور دونوں ہی کو سمجھنے میں مدد پہنچاتے ہیں وہ اس رجائی ماحول کے شاعر ہیں جس میں غالبؔ کو سانس لینے کا موقع بہت کم ملا۔ وہ اس دور کامرانی کی پیداوار ہیں جس میں میرؔ ناکامیوں سے کام لیتے رہے وہ منہدم ہوتی ہوئی دلّی کے نہیں بلکہ نشاط تعمیر سے معمور لکھنؤ کے شاعر ہیں وہ اس ذہنی اور سیاسی قیادت کا جزو رہے ہیں جس نے لکھنؤ کی تکوین و استقلال میں ہاتھ بٹایا تھا وہ ان معماروں میں شریک تھے جنھیں لکھنؤ کا صانع کہنا چاہیے اسی لیے صنّاعی، نشاطیہ ولولہ، رجائی انداز فکر، ہیئت سے دل بستگی حسرت تعمیر کے بجائے عشرت تعمیر اور فکر فردا کے بجائے طربِ امروز صرف ناسخؔ ہی نہیں بلکہ اس عہد اور خطّہ کے سب ہی شعراء کی افتاد مزاج میں داخل تھا یہ رجحانات بھی ایسے ہیں کہ جنھیں نہ حقیر و غیر موثر قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ جامع مطالعہ میں ان کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ ناسخؔ چونکہ اسی قبیلہ کے رہبر تھے اس لیے تاریخی تقاضے کے مطابق ان کے مطالعہ کی بہت اہمیت ہے یہ صحیح ہے کہ وہ گل و شبنم کے شاعر نہ تھے بلکہ سنگ و آہن کے شاعر تھے مگر یہ عنصر بھی تو زندگی کے ضروریات میں شامل ہے اور اس کے بغیر بھی تو زندگی نامکمل ہے۔

ان کی صناعی، لفاظی، مبالغہ آرائی، خیال بندی اور خیال آفرینی، ہیئتی شعبدہ گری

کو ان کی شاعری کا آخری حاصل سمجھنا ایک ظالمانہ غلطی ہے جسے وہی لوگ کر سکتے ہیں. جو نعرہ بلند کرنے والوں کے پیچھے بے سوچے سمجھے چل دیتے ان کے متعلق یہ کہنا کہ انھوں نے زندگی بھر میں صرف گیارہ شعر کہے ہیں یا پوری زندگی میں چند جاندار شعر بھی نہیں کہہ سکے محض مبالغہ آرائی ہے اور ویسی ہی مبالغہ آرائی ہے جس کے لیے ناسخ کو مطعون کیا جاتا ہے۔ محض لفاظی ہے، ویسی ہی لفاظی جس کے لیے ناسخ پر حرف گیری کی جاتی ہے. حقیقت یہ ہے کہ ان کے دیوان میں ایسے بہت سے شعر بھی ملتے ہیں جنھیں سن کر میر اور غالب بھی کھلے دل سے داد دیں. یہ صحیح ہے کہ ان کا رنگ غالب وہی ہے جس کی تفصیل گزر چکی ہے لیکن ان کے ذخیرہ غزلیات میں ایسے اشعار جو جذبہ کی بھرپور گہرائی اور صداقت پر مشتمل ہیں اور اچھی غزل کے شیوۂ دل نشیں کو سمیٹے ہوئے ہیں بغیر کسی خاص جستجو کے برابر نظر آتے ہیں ان کی تعداد ایسی کم نہیں ہے کہ انھیں فقط اتفاقات کے زمرے میں جگہ دی جائے صنایع و بدایع کی موسلا دھار بارش میں اور رعایت لفظی کے گرجتے ہوئے بادلوں میں احساس کی شدت اور گرمی دل کا پیدا کردہ بجلی کا کوندا بھی دکھائی دے جاتا ہے اس طرح کے بہت سے اشعار بطور مثال پہلے ہی درج کیے جا چکے ہیں خاتمہ بحث پر چند مزید اشعار اور درج کیے ہیں۔

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں
دور وہ، میں ہوں مرنے کے نزدیک ہائے کیوں کر میں ناتواں جاؤں
ہو نہ گل گشت میں کہیں وہ گل جی میں ہے آج بوستاں جاؤں

خاک اڑاتا ہوا ہر اک بن میں
صورت گرد کارواں جاؤں

جان ہم تجھ پہ دیا کرتے ہیں نام تیرا ہی لیا کرتے ہیں
چاک کرنے کے لیے اے ناصح ہم گریباں سیا کرتے ہیں
ساغرِ چشم سے ہم بادہ پرست مئے دیدار پیا کرتے ہیں

وہ گل تو ہے کہ گزرا باغ میں جس جس خیاباں سے
تو آوازِ شکستِ رنگ سے گل نے پکارا ہے

عشق کو کس کے دل سے لاگ نہیں کون سا گھر ہے جس میں آگ نہیں
جو ترے عشق میں ہلاک نہیں زندگانی میں لطف خاک نہیں
شبِ فرقت میں شمع کا کیا ذکر زندگی کا چراغ بھی گل ہے

سنسان مثل وادیٔ غربت ہے لکھنؤ
شاید کہ ناسخ آج وطن سے نکل گیا

ان اشعار میں زیادہ تر وہ تازگی، ندرت اور تاثیر موجود ہے جس کی توقع ہم کسی بڑے ہی غزل گو سے کر سکتے ہیں ان اشعار میں سادگی کے ساتھ وہ فطری پرکاری ملتی ہے جو بڑے شاعروں کا شیوہ رہی ہے۔ یہ اشعار اپنی معنویت اور ہیئت کے اعتبار سے غزل کے سخت ترین انتخاب میں بھی جگہ پانے کے مستحق ہیں۔

اہم کتابیات

(Bibliography)

آبِ حیات	مولانا محمد حسین آزاد
آبِ بقا	عبدالرؤف عشرت
بہارِ بے خزاں	احمد حسین سحر
تاریخ اودھ	نجم الغنی
جلوہ خضر	صفیر بلگرامی
داستان تاریخ اودھ	حامد حسن قادری
ریاض الفصحاء	مصحفی
سنان دلخراش	منیر شکوہ آبادی
قیصر التواریخ	محمد میر زائر
کاشف الحقائق	امداد امام اثر
کلیات رشک	میر علی اوسط رشک
کلیات نثر غالب	اسد اللہ خاں غالب
کلیات ناسخ	ناسخ، پہلا ایڈیشن
ناسخ، تجزیہ و تقدیر	شبیہہ الحسن
رسالہ ادیب	1913
رسالہ اردوے (حسرت موہانی)	1903

A Calendars of Middle

East Countries by V. V. Tsybulsky, USSR,

پروفیسر شبیہہ الحسن لکھنؤ یونی ورسٹی کے شعبہ اُردو سے تقریباً ۳۰ سال سے وابستہ ہیں اور گزشتہ دس سال سے پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو ہیں۔ انھوں نے فارسی اور عربی کی منتہی تعلیم حاصل کی پھر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے اردو اور نفسیات میں ایم۔ اے۔ کے علاوہ ایل۔ ایل کی ڈگریاں حاصل کیں انھوں نے لکھنؤ یونی ورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈی لٹ کی سندیں حاصل کیں وہ فارسی و عربی کے علاوہ اسلامیات میں بھی خصوصی مہارت رکھتے ہیں وہ متعدد بلند پایہ کتابوں کے مصنف ہیں اور سو سے زیادہ تنقید و تحقیقی مضامین لکھ چکے ہیں وہ یو جی سی کے منصوبہ کے تحت نیشنل لکچرر بھی رہ چکے ہیں بہت سی مقامی زبانوں اور متعدد زبانوں میں وہ مہارت رکھتے ہیں انھوں نے متعدد ایشائی ملکوں، امریکا اور متعدد یورپی ممالک کے بار بار سفر کیے ہیں اور بہت سی امریکن اور یورپی یونیورسٹیوں میں توسیعی خطبات دیے ہیں انھوں نے بہت سی قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں اور سیمیناروں میں حصّہ لیا ہے اور ان کی صدارت کی ہے۔ اردو کے علاوہ وہ انگریزی اور فارسی و عربی میں بھی لکھتے ہیں وہ ہندوستان اور بیرونِ ہند کی بہت سی علمی اور ادبی انجمنوں سے وابستہ ہیں وہ ہندوستان کے ایک نامور علمی خاندان کی فرد ہیں اور ادیب ہونے کے علاوہ بلند پایہ مقرر و خطیب بھی ہیں۔

Nasikh (Urdu), Rs. 20.